قائداعظم لائبریری کا ادبی مجلّہ 3

دورِ جدید

مخزن لاہور

مدیر: ڈاکٹر وحید قریشی

قائداعظم لائبریری، شاہراہ قائداعظم، باغ جناح لاہور

مجلس ادارت

عنایت اللہ (صدر مجلس)

انتظار حسین

ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر انور سدید

امجد اسلام امجد

ڈاکٹر وحید قریشی (مدیر اعزازی)

محمد ہارون عثمانی (لائبریرین رمعاون مدیر)

جلد۲، شمارہ۱

۲۰۰۳ء

ناشر: قائداعظم لائبریری، شاہراہ قائداعظم باغ جناح لاہور

فون نمبر: ۹۲۰۱۰۰۷ فیکس: ۹۲۰۱۰۰۶

ای میل: qal@brain.net.pk

ویب سائٹ: www.qal.fws1.com

کمپوزنگ: محمد اکرام الحق

مطبع: لائن آرٹ پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ، شاہراہ قائداعظم لاہور

صفحات: ۱۲۸

قیمت: -/100 روپے

جملہ حقوق محفوظ

ضروری نوٹ

(۱) مخزن میں شائع ہونے والے نگارشات کے مندرجات سے قائداعظم لائبریری اور مجلس ادارت کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

(۲) تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو دو نسخے روانہ کیے جائیں۔

(۳) ادبی معاملات میں جملہ خط و کتابت مدیر مخزن، معرفت قائداعظم لائبریری، شاہراہ قائداعظم باغ جناح لاہور سے کی جائے۔

(۴) مالی امور میں چیف لائبریرین قائداعظم لائبریری سے رجوع کیا جائے۔

ترتیب

اداریہ: ۵

شخصیات:

۱۔ کالی داس گپتا رضا (تم جیسے گئے ایسے تو جاتا نہیں کوئی) — ڈاکٹر گوپی چند نارنگ — ۷

ادبیات:

۱۔ نظریے کی جبریت — انتظار حسین — ۱۰

۲۔ میر انیس کے تصور غربت کی اہم جہتیں — مشکور حسین یاد — ۱۳

۳۔ مولانا حسرت موہانی کی دیباچہ نگاری — شفقت رضوی — ۲۱

۴۔ حفیظ ہوشیارپوری اور ان کے چند احباب — ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ — ۳۱

اقبالیات:

۱۔ اقبال کے فن کو پرکھنے کا معیار — پروفیسر ایوب صابر — ۴۲

تراجم:

۱۔ ''برادرز کرامازوف'' کا اردو ترجمہ — ڈاکٹر سہیل احمد خان — ۴۸

کتابے و گوشہ چمنے:

۱۔ ''گوتم کے دیس میں'' ۔ تعارف اور تبصرہ — عنایت اللہ — ۵۲

۲۔ اتحاد، لکھنو سے شائع ہونے والا نادر رسالہ — رفاقت علی شاہد — ۵۸

۳۔ آثار اولیاء — محمد عالم مختار حق — ۷۷

۴۔ انجمن ترقی اردو کی نئی مطبوعات ۔ ایک جائزہ — محمد ہارون عثمانی — ۹۱

مختصر تبصرے:

۱۔ اکیسویں صدی کے لیے نیا خیا (از رفیق ڈوگر) — ڈاکٹر انور سدید — ۹۶

۲۔حکایات جنوں — امجد اسلام امجد — ۹۸
از عطیہ سید
۳۔میر عبدالعزیز، فریڈم سٹرگل ان کشمیر (انگریزی) — ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی — ۹۹
۴۔سہ ماہی ''انشا'' — محمد سعید — ۱۰۳
ڈاکٹر نجم الاسلام نمبر: حصہ اول حیدرآباد

پیروڈی:

۱۔ایک لڑکی بگھارتی ہے دال — کرشن چندر — ۱۰۶
۲۔اردو کی آخری کتاب — پطرس بخاری — ۱۱۱
۳۔لوگ ناؤ میں بیٹھ کر دریا سے پار اتر رہے ہیں — حاجی لق لق — ۱۱۳
۴۔ استاد بولے خاں گلزار کا حال — خضر تمیمی — ۱۱۴

کچھ مخزن کے بارے میں:

۱۔آپ کی آرا اور تبصرے — ۱۱۸
۲۔تبادلے میں موصول ہونے والے رسائل — خلیل احمد چیمہ — ۱۲۴

قائداعظم لائبریری:

قائداعظم لائبریری میں آنے والی نئی اردو کتب — محمد ہارون عثمانی — ۱۲۶

اداریہ

یہ مخزن کا تیسرا شمارہ ہے۔ پہلے دو پرچوں میں مخزن کی پالیسی کے بارے میں وضاحت کی گئی تھی۔ فی الوقت مخزن کے دائرہ کار کے بارے میں کچھ تصریحات پیش کرنا چاہتا ہوں۔

پرچے کا ایک خاص مزاج بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اول: ہمارے پیش نظر قائداعظم لائبریری کا وہ قاری بھی ہے جو انگریزی کا دلدادہ ہے لیکن اردو ادب سے بھی کسی حد تک آشنا ہے اور چاہتا ہے کہ اردو نثر کے بعض اچھے نمونے اس کے سامنے آئیں۔ اس لیے ہم نے ایک سیکشن انتخابات کا بھی شامل کیا ہے۔

دوم: اس وقت جو پرچے پاکستان اور بھارت میں شائع ہو رہے ہیں ان کا ایک بڑا حصہ شاعری پر مشتمل ہوتا ہے۔ مقالوں میں بھی شاعری ہی کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اس لیے یہ پرچے شعری رجحانات کے نمائندہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ شاعری، افسانہ، ناول، ڈرامہ اور انشائیہ مخزن میں شائع کرنے کی بجائے ان کے بارے میں معلومات قاری تک پہنچ جائیں۔

سوم: یہ پرچہ قائداعظم لائبریری کا جریدہ ہے اس لیے اس میں تعارف کتب کو نمایاں حیثیت دی گئی ہے۔

اب یہ قارئین پر منحصر ہے کہ وہ یہ دیکھیں کہ ہم اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب ہیں۔ اس تگ و دو میں ہمارا دائرہ کسی قدر محدود تو ہوا ہے لیکن مخزن کا اپنا ایک مزاج ضرور بن گیا ہے۔

(مدیر اعزازی)

نوٹ

مدیر مخزن ڈاکٹر وحید قریشی کئی ماہ سے سخت علیل ہیں، اس وجہ سے اس شمارے کے مندرجات مکمل کرنے کے باوجود ان کے لیے مشکل ہو گیا کہ وہ اسے آخری شکل دے سکیں۔ مجلس ادارت عیادت کے ساتھ ساتھ ان سے مشورہ کرتی رہی۔ میں مجلس ادارت کی اعانت کا مشکور ہوں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو جلد اور مکمل صحت عطا فرمائے۔

عنایت اللہ
صدر مجلس ادارت

کالی داس گپتا رضا

تم جیسے گئے ایسے تو جاتا نہیں کوئی

گوپی چند نارنگ

افسوس جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں۔ کالی داس گپتا رضا کے اچانک انتقال کی خبر جس نے بھی سنی سکتے میں آ گیا۔ وہ پوری طرح چاق و چوبند تھے۔ شب و روز کام میں ڈوبے ہوئے تھے۔ غالبیات میں انہوں نے ایک کے بعد ایک کتابوں کا جو تانتا باندھ دیا اور جو نام پیدا کیا وہ کسی کے لیے بھی باعث فخر ہو سکتا ہے۔ غالب شناسی سے گہری علمی کمٹ منٹ کی وجہ سے ہندوستان پاکستان دونوں ملکوں میں وہ بہت احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ جناب جمیل الدین عالی اور جناب مشفق خواجہ نے انجمن ترقی اردو پاکستان کی جانب سے ان کو کھلی پیش کش کی تھی کہ غالب پر وہ جو کچھ بھی لکھیں گے انجمن اسے چھاپے گی۔ غلام رسول مہر، امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود اور مالک رام کے بعد کالی داس گپتا رضا غالبیات کا سب سے معتبر نام سمجھے جاتے تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور محقق بھی۔ ان کے شعری مجموعوں کی تعداد ایک درجن سے کم نہیں۔ تحقیق اگرچہ توجہ تخلیق ہی پر کرتی ہے اور سارا معاملہ شعر و ادب ہی کا ہے، تاہم تخلیق میں تو ایک مصرعے سے بھی مغفرت ہو سکتی ہے لیکن علمی کام میں پوری کی پوری عمر کھپ جاتی ہے تب کہیں جا کر پایہ اعتبار حاصل ہوتا ہے۔ کالی داس گپتا رضا ہر چند کہ پچاس، ساٹھ کتابوں کے مصنف و مؤلف تھے، علمی دنیا میں انہیں وقار و اعتبار ساٹھ برس کی عمر کے بعد حاصل ہونا شروع ہوا۔ یعنی ۱۹۸۸ء میں جب انہوں نے اپنی عمر بھر کی تحقیقات علمیہ پر مبنی دیوان غالب کامل شائع کیا۔ اگلے سال ہی ۱۹۸۹ء میں انہیں غالب انسٹی ٹیوٹ کا غالب ایوارڈ دیا گیا۔ مہاراشٹر اردو اکیڈمی کا سراج اورنگ آبادی ایوارڈ (۱۹۹۷ء) میں ملا۔ دہلی اردو اکیڈمی کا بہادر شاہ ظفر ایوارڈ (۱۹۹۶ء) اور ابھی دو برس پہلے ۱۹۹۹ء میں دوحہ (قطر) کا عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ میری تجویز پر دیے گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ ساٹھ ستر برس کی سعی و جستجو کے بعد اب کہیں ان کی زندگی میں بار آنے لگا تھا اور ان کی قدر افزائی ہونے لگی تھی کہ اچانک بلاوا آ گیا۔ ان کا پدم شری ہونا برحق تھا اور مارچ ۲۵ کو وہ راشٹر پتی بھون اپنا ایوارڈ لینے جانے والے تھے۔ اشوک ہوٹل میں قیام تھا۔ وہیں صبح کو ناشتے کے بعد سینے کے بچھلی طرف شدید درد اٹھا۔ چونکہ کوئی عارضہ تھا ہی نہیں، کسی کا خیال قلب کی طرف نہیں گیا۔ ہومیوپیتھی کا علاج خود کرتے تھے۔ دوا لی جو بے اثر گئی۔ اشوک ہوٹل کے ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اس نے انجائنا تشخیص کیا۔ اپنی دوا پر بھروسا بھی عجیب چیز ہے، دوسری دوا جمنا پار اپنے بڑے بھائی کے یہاں سے منگوائی۔ اسی دوران درد نے مزید شدت اختیار کی تو شام تک اسکارٹس اسپتال لے جائے گئے۔ وہاں معائنہ کی کارروائی مکمل کرتے کرتے رات ہو گئی۔ اسی دوران پے بہ پے قلب پر حملہ ہوا۔ نصف شب کے بعد ہنگامی آپریشن

کی تیاری کی جارہی تھی کہ عالم بے ہوشی میں جان، جان آفریں کے سپرد کردی۔ یوں غالبیات کے افق پر ایک روشن ستارہ ٹوٹا اور یادرفتگاں کے غبار میں ہمیشہ کے لیے گم ہوگیا۔

رہنے کو سدا دہر میں آتا نہیں کوئی
تم جیسے گئے ایسے تو جاتا نہیں کوئی

کالی داس گپتا رضا سے میرے روابط بہت دیر میں پیدا ہوئے۔ یوں شناسائی تو ان سے تقریباً پچاس برس سے تھی۔ جس زمانے میں میں دہلی یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کررہا تھا، کالی داس گپتا رضا مشرقی افریقہ میں تھے۔ ان کا تعلق پنجاب کے ایک اگروال گھرانے سے تھا (پیدائش ۲۵ اگست ۱۹۲۵، مکند پور، تحصیل نواں شہر، ضلع جالندھر)۔ ادیب فاضل، منشی فاضل کرکے مشرقی افریقہ چلے گئے تھے جہاں اقربا کاروبار کرتے تھے۔ سینئر کیمبرج کا امتحان انہوں نے یہیں سے دیا، وکالت کا ارادہ تھا لیکن اسے ادھورا چھوڑ دیا۔ اردو کا چسکا پنجاب ہی سے اپنی جان کے ساتھ لگالائے تھے، جوش ملسیانی کے شاگرد تھے جن کا شمار حلقۂ داغ کے نامی گرامی اساتذہ میں ہوتا تھا۔ شاعری گھٹی میں پڑی ہو تو پھر 'چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی' پانچویں دہائی کے آخری برسوں کا زمانہ تھا کہ مشرقی افریقہ سے ان کی دو انگریزی کتابیں آئیں۔ میں دہلی یونی ورسٹی آتے جاتے ہوئے اولڈ سیکریٹریٹ میں گاہے بگاہے آج کل کے دفتر میں رکا کرتا تھا۔ جوش ملیح آبادی پاکستان جاچکے تھے۔ عرش ملسیانی ان کی مسند پر متمکن تھے۔ انہیں کی میز پر رضا صاحب کی کتابوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ایک اور کتاب 'ہندوستانی مشرقی افریقہ میں' بھی اسی زمانے میں منظر عام پر آئی۔ یوں کالی داس گپتا رضا علم وادب کی دنیا میں داخل ہوئے۔

کچھ مدت کے بعد انہوں نے مشرقی افریقہ کو خیرباد کہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بہت سے ہندوستانیوں نے وہاں کی بدسکونت ترک کی، کچھ لندن کی طرف نکل گئے، کچھ ہندوستان کے اطراف میں پھیل گئے۔ کالی داس گپتا رضا بمبئی میں آکر جم گئے۔ شروع میں شعری مجموعوں نے زور باندھا۔ ایک دو بار میری ان کی ملاقات مالک رام کے یہاں ہوئی۔ پھر کبھی کبھار ان کے خط آنے لگے۔ دہلی کے افسانہ نگار بلراج ورما اور شکتی ورما ان دنوں 'تناظر' نکالا کرتے تھے جس کا ایک بسیط نمبر عتیق اللہ تابش نے مرتب کیا تھا۔ اس زمانے میں کالی داس گپتا رضا کی متعدد علمی وتحقیقی تصانیف شائع ہوچکی تھیں۔ ان کی رباعیوں کا مجموعہ 'شعاع جاوید' ادارۂ تناظر سے زیر اشاعت تھا۔ رضا صاحب کی خواہش تھی کہ کتاب میرے مقدمے کے ساتھ شائع ہو۔ بلراج ورما کے تقاضے اپنی جگہ، ڈاکٹر گیان چند جین نے بھی اصرار کیا تو میں نے رباعیاں پڑھیں، اچھی لگیں۔ ان کے علمی کام سے شناسائی تو تھی ہی شاعر کا سکہ بھی چل گیا۔ لیکن سچی بات ہے کہ جو لوگ علمی، تنقیدی میدان میں نام پیدا کرلیتے ہیں اور جن کا اصل میلان علمی کام کی طرف ہوتا ہے، وہ لاکھ قادرالکلام ہوں یا عروض وبدیع وبیان کے ماہر ہوں ان کی شاعری کی طرف بالعموم کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ اس کی مثالیں ایک نہیں کئی ہیں۔ ہر چند کہ بہت سے علما کو ہمیشہ یہ زعم رہا ہے کہ وہ جید شاعر ہیں لیکن زمانے نے ان کی شاعری کو ہمیشہ واجبی ہی سمجھا۔ کالی داس گپتا رضا اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں تھے۔

کالی داس گپتا رضا کا اصل کارنامہ غالبیات اور متعلقات غالب ہے۔ یوں تو انہوں نے اپنے استاد جوش ملسیانی کا بھی حق ادا کیا، ان کے منثورات ومکتوبات کو بھی چھاپا، انتخاب کلام بھی اور ان کے کتابچے 'اقبال کی خامیاں' کو بھی اپنے مقدمے کے

ساتھ از سر نو شائع کیا۔ نیز کلیات چکبست، مقالات چکبست اور باقیات چکبست پر بھی توجہ کی۔ انہوں نے داغ وفراق پر بھی خاصا کام کیا تھا اور اس وقت وہ قومی اردو کونسل کے لیے کلیات فراق کو کئی جلدوں میں مرتب کررہے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالبیات پر انہوں نے جو کام کیا، اعلیٰ درجے کی جو کتابیں شائع کیں اور زندگی بھر کی ان تھک محنت اور تلاش وجستجو سے انہوں نے غالبیات کا جو نادر خزینہ اپنے ذاتی ذخیرے کے طور پر جمع کیا، اس کی وجہ سے ان کا نام اردو کے صف اول کے محققوں میں ہمیشہ احترام سے لیا جائے گا۔ غالب پر انہوں نے کم وبیش اٹھارہ کتابیں شائع کیں جن میں دیوان غالب کی ان اشاعتوں کے عکسی ایڈیشن بھی ہیں جو غالب کی زندگی میں منظر عام پر آئے تھے لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ 'دیوان غالب کامل' کی اشاعت ہے جس میں انہوں نے امتیاز علی خاں عرشی کے کام کو آگے بڑھاتے ہوئے غالب کے اردو کلام کو تمام وکمال تاریخی ترتیب سے مرتب کردیا ہے۔ غالب کے متداول دیوان میں تقریباً اٹھارہ سو اشعار ہیں۔ نسخہ رضا میں نسخہ بھوپال قدیم، نسخہ حمیدیہ، نسخہ شیرانی، گل رعنا اور دوسرے تمام اہم قلمی نسخوں نیز غالب کی زندگی میں چھپے دیوان غالب کے پانچوں ایڈیشنوں کو ملا کر غالب کے اردو اشعار کی تعداد چار ہزار دو سو چھبیس تک پہنچادی ہے۔ نسخہ رضا کی مدد سے حتمی طور پر معلوم ہوجاتا ہے کہ غالب کا کون سا شعر کس زمانے میں کہا گیا اور اس کی مدد سے غالب کے بارے میں بہت سی غلط فہمیوں کا بھی ازالہ ہوجاتا ہے اور بہت سے من گھڑت قصوں اور افسانہ وافسوں کا بھی جو غالب کے شارحین اور ناقدین نے اپنی سہولت کے لیے تراش لیے تھے۔ غالبیات کی دنیا میں یہ اس نوع کا کام ہے جس سے اس راہ میں قدم رکھنے والا کوئی بھی شخص صرف نظر نہ کرسکے گا۔

جامعہ ملیہ کے ہند وپاک اردو افسانہ سیمینار کے بعد اپریل ۱۹۸۰ء میں جب میں انتظار حسین کے ساتھ بمبئی کے سفر پر نکلا تھا، کالی داس گپتا رضا کے گھر پر بھی دعوت کا پروگرام تھا۔ انتظار حسین نے ملتے ہی کہا ''ویسے تو کالی داس میں گپتا بھی زائد ہے مگر رضا آپ کس خوشی میں ہیں؟'' کالی داس نے جواب میں اپنے نوحوں اور سلاموں کا مجموعہ ''شعور غم'' ان کے ہاتھ میں تھمادیا! علمیت کے ساتھ ساتھ وہ رواداری، تہذیب وشرافت کا بھی مرقع تھے، ایک سچے کھرے انسان، غم گساری، دردمندی، صدق وصفا، اخلاق وانکسار کا پیکر جمیل۔ پچھلے دنوں ایک کے بعد ایک کیسی کیسی شخصیات ہمارے بیچ سے اٹھ گئیں، علی سردار جعفری، مجروح سلطان پوری اور اب کالی داس گپتا رضا۔ اردو اپنے تمول کے باوجود پہلے ہی غریب ہے، ان ہستیوں کے اٹھ جانے کے بعد اب غریب تر ہے۔ اب تو قد بھی چھوٹے ہوگئے ہیں، شخصیتیں اس سے بھی چھوٹی۔ کیا کیا جاسکتا ہے، آنے والوں پر کیا ذمہ داری ہے کوئی تو سوچتا ہوگا۔ دیکھیے رضا نے انسان کی کیا تصویر پیش کی ہے۔

دو لمحے کی روشنی میں ڈھل جاؤں گا
شدت کی تپش ہو گی پگھل جاؤں گا
روشن نہ کوئی شمع کہیں کر دینا
ہر رنگ میں، میں آپ ہوں، جل جاؤں گا

نظریے کی جبریت

انتظار حسین

گیلی لیو کے متعلق کہا جاتا ہے کہ پادریوں کے جبر نے اس کی عدالت میں پیشی کرادی۔ دوٹوک کہا گیا کہ یا تو اس خیال سے باز آجاؤ کہ زمین گردش کرتی ہے یا پھر مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ عدالت سے باہر گیلی لیو کے آدرش پسند شاگرد یہ توقع باندھے بیٹھے تھے کہ مرشد کلمۂ حق کہے گا اور دار پر چڑھ جائے گا۔ مگر گیلی لیو عدالت سے ہنستا ہوا باہر آیا۔ شاگردوں نے تعجب سے ہنسنے کی وجہ پوچھی۔ مرشد نے جواب دیا کہ زمین تو اس وقت بھی گردش کر رہی ہے اور کرتی رہے گی مگر میں نے یہ کہہ کر اپنی جان بچالی کہ زمین ساکن ہے۔ اس پر وہ آدرش پسند شاگرد اپنے مرشد سے بہت برہم ہوئے اور بولے کہ بدنصیب ہے وہ قوم جس میں شہید پیدا نہیں ہوتے۔ مرشد نے جواب دیا، بدنصیب وہ قوم ہے جسے شہیدوں کی ضرورت رہتی ہے۔

پتہ نہیں دونوں میں سے سچا کون تھا۔ شاید دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر سچے تھے اور اگر دونوں اپنی اپنی جگہ سچے تھے تو ہم مسلمان لوگ خالی بدنصیب نہیں ہیں تھوڑے خوش نصیب بھی ہیں۔ بقول گیلی لیو ہم بدنصیب لوگ ہیں کہ ہمیں ہر زمانے میں شہیدوں کی ضرورت رہی ہے مگر اسی بزرگ کے شاگردوں کے حساب سے ہم خوش نصیب بھی ہیں کہ جبر کے ہر زمانے میں ہمارے بیچ شہید ظہور کرتے رہے ہیں۔ یعنی مسلمان اپنی تاریخ میں فکر و احساس کی آزادی کی روایت قائم کر سکے ہوں یا نہ کر سکے ہوں انہوں نے بہر حال اسی اعلیٰ انسانی قدر کے لیے شہادت پیش کرنے کی ایک شاندار روایت ضرور قائم کی ہے۔

بازی اگر نہ جیت سکا سر تو دے سکا

کبھی شہنشاہیت، کبھی سامراجیت، کبھی آمریت، کبھی ملائیت، کوئی نہ کوئی الجھیڑا ہماری جانوں کے ساتھ لگا رہا۔ ہر الجھیڑا ہم سے شہید مانگتا رہا، ہم بساط بھر پیش کرتے رہے۔ سب سے بڑی مثال امام حسین کی ہے کہ انہوں نے کربلا میں کلمۂ حق کہا، آزادی ضمیر کا اظہار کیا اور شہید ہوئے۔

اسی مثال سے مجھ پر یہ کھلا کہ ہم تو اپنی تاریخ کے اولین مرحلے ہی میں الجھیڑے میں پھنس گئے تھے۔ بس پھر یہ شہادتیں پیش کرتے ہی عمر گزری۔ کربلا ہمارا مستقل استعارہ بن گیا۔ ہم کتنے بدنصیب ہیں اور کتنے خوش نصیب ہیں۔

اب میں اپنے ہم عصروں سے ایک مثال لاتا ہوں۔ وہ ایوب خان کا زمانہ تھا اور ہمارا دوست احمد مشتاق اٹھتے بیٹھتے ناصر کاظمی کو طعنے دیتا تھا کہ ناصر تم اس عہد کے نمائندہ شاعر ہو اور یہ سچ بولنے کا وقت ہے۔ ناصر کاظمی نے آخر ایک دن سنا، دوسرے دن سنا

اور جواب دیا کہ مشتاق روز روز سچ نہیں بولا جاتا۔ میں ایک دفعہ کربلا میں سچ بول چکا ہوں۔ اب تمہاری باری ہے۔ وہی گیلی لیو اور اس کے شاگردوں کا قصہ۔

بے شک وہ بہت بڑا جبر تھا جس کے خلاف امام حسین نے شہادت پیش کی تھی۔ مگر جبر کی ایک صورت وہ بھی تو تھی جس کے ردعمل میں حافظ اور خیام کی رندانہ شاعری پیدا ہوئی تھی اور ہماری ہند اسلامی روایت میں اس ردعمل کا ایک بڑا نشان امیر خسرو ہیں۔ پھر میر، غالب اور نظیر اکبر آبادی۔ جس جبر کا یہ لوگ ردعمل ہیں وہ ہے جسے انگریزی اصطلاح میں Puritanism کہتے ہیں۔ طہارت پسندی جو ہماری آزادی فکر و احساس کی راہ میں مستقل روڑے اٹکاتی چلی آرہی ہے اور اب ان نقادوں دانشوروں سے جنہوں نے کلاسیکی غزل پر زوال پسندی اور فراریت کے فتوے لگائے تھے معذرت کے ساتھ ایک بات۔ ہماری کلاسیکی غزل مزاحمتی شاعری کی ایک اونچی مثال ہے۔ یہ رند اپنے ہزار شیووں کے ساتھ کس قسم کا کردار ہے اور کیوں واعظ اور شیخ سے الجھ رہا ہے۔ خالی خولی شرابی۔ شاید نہیں۔ یہ کردار تو وسیع المشربی اور آزاد خیالی کا پیکر نظر آتا ہے۔ شاید آزاد تخلیقی روح جو ہماری تہذیب کو تعصب اور تنگ نظری کی دستبرد سے بچانے کی کوشش کر رہی ہے۔ طہارت پسند حضرات اس تہذیب کو گھوٹ کر ایک جوئے کم آب بنانے کے درپے ہیں۔ مگر اس کی روح وسعت مانگتی ہے۔ مسلمانوں کی تخلیقی روح اپنے اظہار کے لیے اتنی آزاد فضا مانگتی ہے جتنی سمجھ لیجیے کہ الف لیلہ میں نظر آتی ہے۔

اصل میں سمجھا یہ جاتا رہا ہے کہ ہماری تہذیب میں بس تصوف کی روایت طہارت پسندوں کے تعصب اور تنگ نظری کے خلاف مصروف کار رہی ہے۔ اور میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ ہمارے شعر و ادب اور فنون لطیفہ کی روایت بھی اسی قوت کے ساتھ اس زمانے کے خلاف برسرپیکار رہی ہے۔ تو اگر ہمارے یہاں تصوف کی روایت اور شعر و ادب اور فنون لطیفہ کی روایت میں ایک رشتہ نظر آتا ہے تو اس کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ دونوں کو ایک مشترکہ دشمن سے سابقہ پڑا ہوا ہے اور غزل تو ہے ہی پوری تحریک مزاحمت۔ بے شک غزل گل و بلبل کی شاعری ہے مگر یہ گل و بلبل کا اتنا تذکرہ ہے کیوں اور زلف و رخسار کی حکایت کو اتنا طول کیوں دیا جا رہا ہے؟ بس طہارت پسندوں کی نفی حسن کے پس منظر میں اس کی معنویت زیادہ سمجھ میں آتی۔

اب یہ بات میں نے کہنے کو تو کہہ دی مگر مفت میں دو گروہوں کی دشمنی مول لے لی۔ بات یہ ہے کہ آج کل طہارت پسند حضرات بھی گل و بلبل کی شاعری پر بہت نکتہ چینی کرتے ہیں اور کم و بیش وہی باتیں کہتے ہیں جو اگلے زمانے کے ترقی پسند کہا کرتے تھے۔ ویسے تو ان دونوں گروہوں میں ایک کتے کا سر ہے۔ مگر کیا پتہ ہے طرز احساس کی سطح پر کوئی رشتہ موجود ہو۔ اصل میں جہاں بھی نظریہ آئے گا شاعری کے متعلق ایسی ہی باتیں کی جائیں گی۔

اب میرا جی چاہتا ہے کہ روسو کے ایک فقرے میں تھوڑی سی ترمیم کر دوں۔ آدمی آزاد پیدا ہوا تھا مگر اب وہ ہر جگہ نظریوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ ایک وقت تھا کہ بس سیدھے سچے لوگ تھے، ان کے جذبات اور احساسات تھے، مشاہدات اور تجربات تھے اور بس۔ ناچتے گاتے تھے، شعر کہتے تھے، الاؤ کے گرد بیٹھ کر کہانی سنتے سناتے تھے اور مگن رہتے تھے۔ جیسے بلبل چہکتی رہتی ہے، کوئل

کوئی رہی ہے اور سن رہی ہے۔ تیر جس سے کوئی آج بھی نہیں پوچھتا کہ بی بی اس تیرے چھلنے کا مقصد کیا ہے۔ نہ کوئی سے کوئی سوال کرتا ہے کہ آخر اس کو کنے کی افادیت کیا ہے۔ مگر شاعر نظریہ بازوں کے نرغے میں گھر گیا ہے۔ اس سے یہ سوال کیا جاتا ہے اور یہ سوال یوں سمجھیے کہ فکر و احساس پر پابندی کا حرف آغاز ہوتا ہے۔ نظریوں کی یہ بنیادی صفت ہمیں یاد رکھنی چاہیے کہ وہ اکل کھرے ہوتے ہیں۔ دو صوفیا کی واردات کتنی ہی مختلف ہو مگر وہ ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہتے۔ شاعری کی مختلف طرزیں ایک دوسرے کے ساتھ گزارہ کر سکتی ہیں۔ رزم کی شاعری اور بزم کی شاعری ایک ہی وقت میں پروان چڑھ سکتی ہے۔ مگر کوئی نظریہ دوسرے نظریے کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتا۔ ہر نظریہ باقی نظریوں کو تہس نہس کر کے فتح کا پرچم بلند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک ہی وقت میں سو رنگ کے پھول آرٹ اور ادب کے چمن میں تو کھل سکتے ہیں، نظریوں کی بنجر دنیا میں نہیں۔ جب کوئی نیا نظریہ سر اٹھاتا ہے تو گویا فکر و احساس کی آزادی کے لیے ایک نیا خطرہ پیدا ہوتا ہے اور جب کوئی گروہ فکر و احساس پر پابندی لگانے کا جتن کرتا ہے تو وہ کسی نہ کسی نظریے کا سہارا لیتا ہے۔ کیونکہ فکر و احساس کی آزادی کو کچلنے کے لیے نظریے سے زیادہ موثر ہتھیار ابھی تک آدمی نے دریافت نہیں کیا ہے۔

پس جب کوئی دانشور کسی نئے نظریے کی کمک کے ساتھ گرجتا برستا آتا ہے اور اس قسم کے محاکم کرتا ہے کہ فلاں فلاں شاعری رجعت پسندانہ ہے اور فلاں فلاں ادبی رویہ زوال پسندی ہے یا یہ کہ لکھنے والے کو میرے تجویز کردہ نسخہ کے تحت سوچنا اور لکھنا چاہیے تو مجھے شک ہونے لگتا ہے کہ کہیں کلاسیکی غزل کا محتسب یا واعظ یا شیخ نئی منطق سے مسلح ہو کر تو نہیں آ گیا ہے۔ یا یہ کہ ملائیت کا یہ کوئی نیا برانڈ تو نہیں ہے۔ اور دیکھیے فکر و احساس پر پابندی تو بہر حال پابندی ہی ٹھہرے گی۔ خواہ پرانی منطق سے نکالی جائے یا نئی منطق سے لگائی جائے اور یہ کہ جابروں کی طرف سے لگائی جائے یا جبر کے خلاف لڑنے والوں کی طرف سے لگائی جائے۔ کیونکہ کبھی کبھی یوں بھی تو ہوتا ہے کہ آزادی ذہن و قلم کے لیے لڑنے والے خود آزادی ذہن و قلم کے لیے خطرہ بن جاتے ہیں اور یہ خطرہ زیادہ سنگین ہوتا ہے، اس لیے کہ جابر کا معاملہ تو کھلا ڈلا ہوتا ہے لیکن جبر کے خلاف جہاد کے دریچوں سے تو ایک گلیمر وابستہ ہوتا ہے۔ سو جب وہ سوچنے اور لکھنے والوں پر خاص طور سے سوچنے اور لکھنے کی پابندیاں لگاتے ہیں تو شروع میں خطرے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ آنکھیں اس وقت کھلتی ہیں جب ان کے ہاتھ میں طاقت آ چکی ہوتی ہے اور اپنی تاریخ کا یہ ماجرا بھی عجب ہے یا شاید پوری انسانی تاریخ ہی کا ماجرا ہو کہ جدوجہد کے وقت میں کربلا کی مثال کا اعلان کیا جاتا ہے مگر کامیابی کے بعد کربلا کا نام لینے والے کربلا سے گزر جاتے ہیں۔ اور دوسروں کے لیے کربلا پیدا کرتے ہیں اور اس عمل میں کل کے رفیق آج کے دشمن ہوتے ہیں۔ یوں مظلوموں کی ہر فتح کے ساتھ نئے ظالم اور نئے مظلوم پیدا ہو جاتے ہیں۔

مطلب یہ ہوا جو شخص سوچتا ہے، محسوس کرتا ہے اور کہتا ہے، وہ غریب تو اکیلا ہوتا ہے، جن سے خستگی میں داد پانے کی توقع ہوتی ہے ان کی طرف سے بھی پتہ نہیں ہوتا کہ کس وقت بیداد کا تیر چل جائے اور چونکہ یہ تیر نظریے میں بجھا ہوا ہوتا ہے اس لیے زیادہ قاتل ہوتا ہے۔ سو زمانہ پر آشوب ہے اور سوچنے اور لکھنے والا اکیلا ہے اور نرغے میں ہے۔ یعنی وہ جو واقعی سوچتا ہے اور واقعی لکھتا ہے۔

میر انیس کے تصورِ غربت کی اہم جہتیں

مشکور حسین یاد

میر انیس کی ایک بیت پڑھ کر مجھے پہلی بار شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ ہم انیس کو پڑھتے ہوئے ہزار فضائے کربلا سے نکلنا چاہیں تب بھی نکل نہیں سکتے۔ حالانکہ میر انیس کے اکثر مراثی میں یوں لگتا ہے جیسے اب وہ فضائے کربلا سے نکل کر عام انسانی فضا میں داخل ہو رہے ہیں لیکن دوسرے لمحے ہی احساس ہوتا ہے ابھی تک عام انسانی فضا میں اور فضائے کربلا میں جدائی کہاں پیدا ہوئی ہے کہ ہم ایک فضا سے دوسری فضا میں داخل ہونے کی سچائی کو محسوس کر سکیں۔ میر انیس کی جس بیت کو پڑھ کر مجھے یہ احساس ہوا پہلے وہ بیت تو سن لیجیے۔ اس میں بہت سادہ سی بات کہی ہے اتنی سادہ کہ پہلے مصرع کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔

غربت میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا

ظاہر ہے جب آپ کو کوئی جانتا ہی نہیں ہے تو آپ کو کوئی پوچھے گا کیوں۔ پوچھنے کا سوال تو اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب آپ کسی کو جانتے ہوں اور پھر یہ جاننے والی بات بھی کوئی ایک دو دن کی بات نہیں ہوتی، آدمی کو ایک دوسرے سے شناسائی حاصل کرنے کے لیے بھی کچھ عرصہ درکار ہوتا ہے۔ ویسے شناسائی کے اس عرصے کو متعین بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بعض اوقات آپ ایک دو ملاقاتوں ہی میں ایک دوسرے کے اس قدر قریب آ جاتے ہیں کہ پھر آپس میں اجنبیت باقی نہیں رہتی اور کبھی کبھی بہت وقت لگ جاتا ہے پھر بھی ایک دوسرے کے قریب نہیں آتے۔ یعنی آپ بظاہر تو ایک دوسرے سے شناسا ہو جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود اجنبیت دور نہیں ہوتی، یعنی آپ ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہی رہتے ہیں اور یوں آپ پر سے عالم غربت دور نہیں ہوتا۔ بہر حال غربت کا عالم آدمی پر بے حد کٹھن ہوتا ہے۔ بس غربت کے اسی عالم کو میر انیس نے اپنی اس بیت میں بیان کیا ہے۔ اب میں وہ پوری بیت لکھ رہا ہوں:۔

غربت میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا
شمعیں بھی جلاؤ تو اجالا نہیں ہوتا

غربت کے بارے میں پہلے مصرع کی سیدھی سادی سی بات کو دوسرے مصرع نے ایک طرح معما بنا ڈالا ہے یا آپ اس بات کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ دوسرے مصرع ہی سے بیت میں صحیح معنی میں شعریت پیدا ہوئی ہے۔ ورنہ ہم پہلے مصرع کی بات کو معمولی بات سمجھتے ہیں مگر وہی بات کہ یہ معمولی بات نہیں ہے۔ اگر آپ پر غربت کا عالم ذرا مسلسل گزرنے لگے تو آپ کو پتا چلے کہ کسی کا آپ کو نہ پوچھنا کس قدر اذیت ناک صورت حال ہے اور اس صورت حال کا آپ کی پوری زندگی پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔

پوچھنا تو بڑی بات ہے اگر کوئی چلتے ہوئے آپ کو ہیلو بھی کہہ دیتا ہے یا آپ کے سلام کا جواب بھی دیتا ہے یا آپ کو سلام کا اشارہ بھی کر دیتا ہے تو آپ کی پوری ذات میں ایک ایسی توانائی آ جاتی ہے جس کا آپ کو احساس صحیح معنی میں اسی وقت ہوتا ہے جس وقت کوئی آپ کو ہیلو نہ کہے یا آپ کے سلام کے جواب میں سلام نہ کہے یا آپ کو سلام کا اشارہ نہ کرے۔ غرض آدمی کو آدمی کا نہ پوچھنا اتنی بڑی تکلیف دہ بات ہے جس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اسی صورت حال کو میر انیس نے اپنی بیت زیر بحث میں پیش کیا ہے۔ اور اس بیت کے دوسرے مصرع میں پہلے مصرع کی بظاہر معمولی بات کی اہمیت کا احساس دلایا ہے۔ ہاں تو میں پہلے مصرع اول دوبارہ لکھتا ہوں:

غربت میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا

پوچھنے والا نہیں ہوتا تو کیا ہو جاتا ہے، ذرا دوسرا مصرع سماعت فرمائیے:

شمعیں بھی جلاؤ تو اجالا نہیں ہوتا

آپ نے ملاحظہ فرمایا غربت میں یہ ہوتا ہے کہ آدمی کی آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا ہے اور یہ اندھیرا ایسا ہوتا ہے کہ اسے روشنی کے عام ذرائع کو استعمال میں لا کر دور نہیں کیا جا سکتا۔ میں سمجھتا ہوں یہ انسان کے لیے عالم تنہائی سے بھی بڑھ کر تکلیف دہ صورت حال ہوتی ہے۔ یا آپ اسے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ عالم تنہائی ہی کی انتہا درجے کی ایک صورت ہے۔

مطلب یہ ہے کہ یہ جو ہمیں عام اور معمول کی زندگی میں سب کچھ نظر آتا ہے۔ ہمارے حواس درست رہتے ہیں یا ہماری دیکھنے، سننے، چھونے، سونگھنے اور چکھنے کی صلاحیتیں برقرار رہتی ہیں یہ سب کچھ صدقہ ہوتا ہے ہمارے اردگرد کے ابنائے جنس کا، ان کی توجہ کا، ان میں ہمارے آنے کے احساس کا، ہم سے ان کے میل جول کا، اب اگر یہ سب کچھ ختم ہو جائے یا ہم گوشۂ تنہائی میں جا کر بیٹھ جائیں تو کچھ دیر بعد ہمارے یہ سب ہوش و حواس جواب دے جاتے ہیں۔ ''شمعیں بھی جلاؤ تو اجالا نہیں ہوتا''۔ یہ مصرع اپنی جگہ میر انیس کی فصاحت اور بلاغت کا بہترین نمونہ ہے بلکہ کمال کا نمونہ ہے۔ اسی طرح فصاحت اور بلاغت کے اعتبار سے اس بیت زیر بحث کا پہلا مصرع بھی کمال کا ہے۔ ''غربت میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا''۔

لیکن غربت کا عالم انسان پر وطن سے دور جا کر ہی وارد نہیں ہوتا۔ عین وطن میں بھی آپ غربت کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اس کا سبب ایک آپ کی اپنی ذات ہو سکتی ہے اور دوم اس کا سبب دوسرے لوگ ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ خود اپنے اردگرد کے لوگوں سے اچھی طرح نہیں ملتے تو آپ غربت کو گویا خود اپنی ذات پر وارد کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں اور دوسری صورت یہ ہے کہ لوگ آپ کو نہ سمجھ رہے ہوں یا بوجوہ انہیں آپ کی معرفت نہ ہو رہی ہو تو ایسی صورت میں بھی آپ غریب ہی رہتے ہیں۔ میر انیس کا کمال بلاغت یہی ہے کہ انہوں نے اپنی بیت زیر بحث میں اس طرح کی کوئی تقسیم نہیں کی۔ بس سیدھے سادے الفاظ میں غربت کی صورت حال کو آپ پر واضح کر دیا ہے۔ جہاں تک ان سوالات کا تعلق ہے کہ آپ غریب ہیں بھی یا نہیں اور اگر غریب ہیں تو کس طرح کے غریب ہیں؟ آپ نے غربت کو خود اپنے آپ پر وارد کیا ہے یا آپ کے معاشرے کے دیگر افراد نے آپ کو غریب بنایا ہے۔ ان تمام سوالات کی ذمہ داری آپ پر ہے، یعنی ان تمام سوالات کے جواب آپ کو خود دینے ہیں۔ بلکہ ان سوالات سے جواب آپ کو دینے چاہئیں۔ اگر آپ ان سوالات کی طرف سے غفلت اختیار کرتے ہیں تو گویا آپ اپنی ذات سے خود غریب

ہوئے جا رہے ہیں اور اپنی غربت کو دور نہیں کرنا چاہتے۔ غربت کو دور کرنا اصل میں زندگی کو سرسبز و شاداب کرنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ جس معاشرے میں آدمی غریب ہو جاتا ہے پھر نہ وہ اس معاشرے کے قابل رہتا ہے اور نہ معاشرہ اس کے قابل رہتا ہے۔ آدمی تنہا غریب کبھی نہیں ہوتا اس کے ساتھ معاشرے کے دوسرے افراد بھی غریب ہو جاتے ہیں۔ اب یہ ایک بالکل الگ سا سوال ہے کہ معاشرے کے افراد اپنی غربت کے احساس ہی سے عاری ہوں۔

محمد ﷺ و آل محمد ﷺ کی زندگیوں کا سب سے بڑا المیہ یہی تھا کہ معاشرہ اور اس کے افراد ان کے لیے غریب نہیں تھے۔ ان کی یعنی محمد ﷺ و آل محمد ﷺ کی کوشش ہمیشہ یہی رہی کہ جس طرح وہ اپنے معاشرے کے افراد کے دکھ درد اور مسرت و انبساط کو سمجھتے ہیں، اسی طرح معاشرے کے افراد بھی ان کے یعنی محمد ﷺ و آل محمد ﷺ کے دکھ درد کو اور خوشی و انبساط کو سمجھیں لیکن اس وقت کے افراد معاشرہ اپنی رجعت پسندی اور کج فہمی کے باعث محمد ﷺ و آل محمد ﷺ کو نہیں سمجھ پا رہے تھے۔ ادھر محمد ﷺ و آل محمد ﷺ نے لوگوں کو سمجھانے میں کبھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ آپ جانتے ہیں انسان کا سب سے بڑا اختیار سمجھنے کا ہے، یعنی انسان جتنا سمجھنے کے ضمن میں آزاد ہے ایسی آزادی اسے کسی دوسرے عمل میں نصیب نہیں۔ اسی لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ جہاں کچھ سمجھانے کا مسئلہ آتا ہے وہاں یہ ذمہ داری اللہ اپنے رسول ﷺ پر نہیں ڈالتا بلکہ قل کہہ کر یہ ذمہ داری اپنے سر مول لے لیتا ہے؟

ہاں تو غربت کا ایک اہم ترین اور کرب ناک پہلو یہ ہے کہ آپ تو لوگوں کے دکھ سکھ اور غم و خوشی میں برابر کے شریک ہوں لیکن لوگوں کا آپ کے دکھ سکھ میں شریک ہونا تو بڑی بات وہ آپ کی عمومی صورت اخلاق ہی کی طرف توجہ نہ دیں۔ اب آپ خود بتائیے ایسی صورت میں زندگی کیسی کرب ناک نہیں ہو جاتی۔ آنحضرت ﷺ کے لیے سب سے بڑے کرب کی صورت یہی تھی۔ وہ مسلسل لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں مصروف رہے اور اہل بیت اور اصحاب کرام کو چھوڑ کر لوگوں نے عموماً اور مسلسل ان کی طرف سے عدم توجہی کا مظاہرہ کیا اور اگر آپ میں اس حقیقت حال کو گوش گزار فرمانے کی جرأت ہے تو سن لیجیے کہ یہ عدم توجہی کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ ایک طرف محمد ﷺ و آل محمد ﷺ غریب ہیں اور دوسری طرف پوری مسلم امہ بری طرح سے غربت کا شکار ہے۔ امت کو محمد ﷺ و آل محمد ﷺ سے جتنا قریب ہونا چاہیے تھا وہ اتنی قریب نہیں ہے۔ اس ضمن میں مسلم امہ کے سب فرقے برابر کے شریک ہیں۔ کہنے کو سب قریب ہیں لیکن عملاً کوئی بھی قریب نہیں۔ ہمیں من حیث القوم من حیث الملت اس بات کو تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں ہونی چاہیے کہ کم از کم تسلیم کرنے سے بھی بہت کچھ بات بن جانے کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔

محمد ﷺ و آل محمد ﷺ کی تعلیم یہی تو ہے کہ مسلمان پورے صدق دل سے اللہ پر ایمان لائیں، آخرت پر ایمان لائیں۔ نبی آخر الزماں کے پیغام اور اللہ کی کتاب قرآن پر ایمان لائیں اور آنحضرت ﷺ کے اسوہ حسنہ پر ایمان لائیں۔ اگر اس طرح مسلم امہ کا ایمان مکمل ہو جائے تو اس پر یعنی مسلم امہ پر کبھی غربت نہیں چھا سکتی۔ یعنی ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی بات کو سمجھے اس کی ذات کو سمجھے جس کے نتیجے میں صحیح معنی میں ملت میں اخوت پیدا ہو۔ آنحضرت نے اپنے اصحاب پاک کو اور اپنے اہل بیت کو اپنی تعلیم و تربیت سے اسی لیے نوازا تھا کہ پوری مسلم امہ اسوہ حسنہ پر چل کر اخوت کے رشتہ میں منسلک ہوتے ہوئے دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن جائے لیکن افسوس صد افسوس ایسا نہیں ہو سکا۔ بغور دیکھا جائے تو آج تمام عالم اسلام غربت کے عالم

میں ہے۔ جی ہاں بیت زیر بحث کے مطابق:

غربت میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا
شمعیں بھی جلاؤ تو اجالا نہیں ہوتا

جہاں تک مادی وسائل کا تعلق ہے مسلم ممالک میں کس چیز کی کمی ہے۔ قدرت نے سبھی کچھ تو دیا ہوا ہے۔ لیکن قدرت کے اس دیے ہوئے سرمایے کی روشنی سے ہمارے گھر، ہمارے شہر، ہمارے ملک روشن نہیں ہیں کیوں؟ اس لیے کہ ہم میں آپس میں اتفاق نہیں ہے۔ اتفاق اور اتحاد کے نور سے جب تک ہمارے دل روشن نہیں ہوں گے ہماری فضائے زندگی پر اندھیرے ہی چھائے رہیں گے۔ محمد ﷺ و آل محمد ﷺ یہی سمجھاتے رہے لیکن مسلم امہ نے تا حال اس بات کو نہیں سمجھا۔ کربلا میں ہر جان پر کھیلنے والا آخر دم پر یہی سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر ہر شہید کے پیغام پر اور سب سے بڑھ کر نواسۂ رسول حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے اس پیغام اخوت پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ انیس کے ایک مرثیے کے حوالے سے سب عزیز اقربا شہید ہو چکے ہیں۔ امام حسین رضی اللہ عنہ بے کسی کے عالم میں ہیں لیکن امت کا خیال دامن گیر ہے:

حضرت پہ ادھر ہوتی ہے اعدا کی چڑھائی — تنہا ہیں نہ بیٹا نہ بھتیجا ہے نہ بھائی
سیدانیاں دیتی ہیں محمد کی دہائی — اعدا میں یہ غل ہے کہ کرو فتح لڑائی
ڈوبے ہوئے خوں میں شہدا گرد پڑے ہیں
گھوڑے پہ اکیلے شہِ ابرار کھڑے ہیں

اسی مرثیے کے اگلے بند کی بیت ہے:

یہ شوق شہادت ہے شہنشاہ زمن کو
بوچھاڑ سے تیروں کی بچاتے نہیں تن کو

اس سے آگے کا بند اس طرح شروع ہوتا ہے:

ہیں آگ میں تیغوں کے کھڑے پر نہیں کچھ غم
امت پہ نہ آنچ آئے دعا ہے یہی ہر دم

اسی طرح اس سے آگے کے بند کی بیت ہے:

پانی کے بھی طالب نہیں گو تشنہ دہن ہیں
کلمے ہیں نصیحت کے، محبت کے سخن ہیں

یہ تو امام عالی مقام کی بات تھی اب امام عالی مقام کے ساتھیوں کے بارے میں بھی سن لیجیے۔ میر انیس اپنے ایک مرثیے کو اس طرح شروع کرتے ہیں۔ دیکھ لیجیے یہ کربلا کے غریب لوگ تھے۔

جب غازیان فوج خدا نام کر گئے — لاکھوں سے تشنہ کام لڑے کام کر گئے
امت کی مغفرت کا سرانجام کر گئے — فیض اپنا مثل ابر کرم عام کر گئے

پڑھتے ہیں سب درود جو ذکر ان کے ہوتے ہیں
ایسے بشر وہ تھے کہ ملک ان کو روتے ہیں

مندرجہ بالا بند میں ایک مصرع خصوصیت کے ساتھ قابل غور ہے۔ فیض اپنا مثلِ ابر کرم عام کر گئے۔ بظاہر یہ مصرع اپنے سے قبل مصرع کی تفسیر معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ آپ نے دیکھا اس سے پہلا مصرع یہ ہے "امت کی مغفرت کا سرانجام کر گئے" مطلب یہ ہے کہ شہادت کے وقت ان کے سامنے صرف اللہ کی ذات یا امام حسین رضی اللہ عنہ کی ذات نہیں تھی۔ ان کے حوالے سے ان کے پیشِ نظر پوری امت کی بھلائی تھی۔ بالکل اس طرح جس طرح بادل برستا ہے تو وہ یہ نہیں دیکھتا کہاں برسے وہ ہر جگہ کو سیراب کرتا ہے۔ اس سے ہر جگہ فیض یاب ہوتی ہے۔ انہی امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں کے بارے میں میر انیس اگلے بند میں فرماتے ہیں:

دیندار و سرفروش و شجاع خوش اعتقاد
ہاتھوں میں تیغیں اور دلوں میں خدا کی یاد

دین دار بھی، سرفروش بھی، بہادر بھی اور اعتقاد میں بھی صاف ستھرے۔ پہلے مصرع کی یہ صفات اپنی جگہ لیکن ان صفات کا عملی ثبوت دوسرے مصرع میں کس خوبصورتی کے ساتھ دیا گیا ہے۔ ان افراد کے ہاتھوں میں یقیناً تلواریں تھیں اور حق کی راہ میں وہ لڑنے پر آمادہ تھے لیکن اس ظاہر کے ساتھ ان کے باطن کا یہ حال تھا کہ ان کے دل خدا کی یاد سے بھرپور تھے۔ ہاتھوں میں تیغیں اور دلوں میں خدا کی یاد۔ آپ اس مصرع کو جتنی بار دہراتے ہیں ان افراد کے یادِ خدا سے لبریز اجسام کے جلوے اسی حساب سے نو بہ نو اور تر و تازہ نظر آئیں گے۔ ان خدا کے جیالوں کی نئی سے نئی تقریریں آپ کے قلب و نگاہ کو روشن کرتی جاتی ہیں۔ یہ افراد اپنی جگہ ایسے بے مثال تھے کہ زمانہ انہیں تا بہ ابد یاد رکھے گا۔

برسوں رہے گا چرچ میں گر آسمان پیر
لیکن نظر نہ آئے گا ان کا کہیں نظیر

اسی بند کا ایک مصرع ہے۔ خورشید جن کے سامنے اک ذرۂ حقیر۔ اس کے بعد اگلا بند ہے:

رستم اٹھا نہ سکتا تھا سر ان کے سامنے — شیروں کے کانپتے تھے جگر ان کے سامنے
پھیکی تھی روشنی قمر ان کے سامنے — اڑتا تھا رنگ روئے سحر ان کے سامنے
بخشا تھا نور حق نے ہر اک خوش صفات کو
ہوتا تھا دن جو گھر سے نکلتے تھے رات کو

اور ان افراد میں یہ صفات کیسے پیدا ہوئیں:

تاثیر کر گئی تھی انہیں صحبت امام — تھا نزع میں بھی خشک لبوں پر خدا کا نام
لبریز تھے محبت حیدر میں دل کے جام — ذی قدر ذی شعور دلاور نجیب کام

یہاں سوچنے اور ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ان افراد کا خاندان رسالت سے براہ راست تعلق نہ تھا۔ لیکن امام عالی

مقام کی صحبت کا ان پر یہ اثر ہوا کہ عالم نزع میں خشک لبوں پر خدا کا نام آ رہا ہے اور محبت حیدر نے انہیں ذی قدر بنا دیا، ذی شعور بنا دیا پھر یہ دلاور بھی تھے۔ اپنے کام میں پختہ اور مبارک بھی۔ جب صحبت امام کا یہ اثر ہے تو صحبت رسول کا کیا اثر نہیں ہوگا۔ ذی شعور مسلمان اسی لیے اہل بیت رسول کو بلند مرتبہ اور عالی قدر گردانتے ہیں کہ انہیں صحبت رسول میسر آئی تھی اور صرف صحبت ہی نہیں پوری طرح پرورش اور تعلیم و تربیت بھی۔ بہر حال خود امام عالی مقام اور ان کے ساتھی میدان کربلا میں غربت کے انتہائی درجے پر تھے لیکن ان غربا کا اپنے رسول کی امت سے براہ راست رابطہ تھا اور یہ رابطہ اور ضابطہ آخر وقت تک قائم رہا کہ آخر وقت تک ان پاکیزہ نفوس نے امت کے لیے دعائیں کی ہیں۔ ان افراد نے غربت کے عام تصور کو بھی بدل کر رکھ دیا۔ آدمی ہمت اور حوصلے سے کام لے تو انتہائی درجے کی غربت کے عالم میں بھی ایک آفاقی انسانی معاشرہ سے تعلق قائم رکھ سکتا ہے اور اسے یہ نہیں کہنا پڑتا کہ شمعیں بھی جلاؤ تو اجالا نہیں ہوتا۔ دراصل یہ نفوس اپنے دلوں کی شمعیں روشن رکھتے ہیں اور جب انسان اپنے دل کی شمع روشن رکھنے کی جرأت سے فیض یاب ہو جاتا ہے پھر اسے دنیا کا کوئی اندھیرا بینائی سے محروم نہیں رکھ سکتا۔ میر انیس نے عام غربت کے تصور کو پیش کر کے ایک اعلیٰ تصور غربت کی طرف بھی ہمارے ذہنوں کو منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم اعلیٰ کی طرف اسی وقت جا سکتے ہیں جب ہمارے ذہن میں ادنیٰ کا تصور بھی واضح ہو اور انیس نے بیت زیر بحث میں غربت کے اسی ادنیٰ تصور کی انتہائی صورت کو پیش کیا ہے۔ لیکن اب غربت کا اعلیٰ تصور بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔ جب تمام عزیز و رفقا حضرت علی اکبر سمیت شہید ہو چکے تھے تو امام مظلوم تنہا میدانِ کارزار میں تشریف لاتے ہیں۔ اس مرثیے کے آغاز کے تیور ہی قابل صد غور ہیں:

جب جنگ کو میداں میں شہ تشنہ لب آیا　　اعدا میں پڑا غل کہ امیر عرب آیا
اس فوج پہ آفت ہوئی نازل غضب آیا　　اب تک اسے آیا تھا نہ غصہ، پر اب آیا
کیا شاد تھے سب مار کے ہم شکل نبی کو
اب رو کے کوئی سبطِ رسول عربی کو

یہ عجیب عالم غربت ہے اور انیس نے اس عالم غربت کے روحانی پہلو سے قطع نظر زیادہ تر انسان کے نفسیاتی پہلو کا اظہار کیا ہے۔ دشمن کی فوج کو خیال تھا کہ سب عزیز فوج کے علمدار حضرت عباس رضی اللہ عنہ سمیت شہید ہو چکے ہیں اور تو اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا کڑیل جوان بیٹا علی اکبر بھی شہید ہو چکا ہے اب تو امام حسین رضی اللہ عنہ بہت نڈھال ہوں گے اب وہ میدان میں آ کر کیا جنگ کر سکیں گے لیکن جس انداز سے امام مظلوم میدان جنگ میں آتے ہیں اسے دیکھ کر تمام فوج پریشان ہوگئی۔ اس بند کا پہلا مصرع ہی امام عالی مقام کی کیفیت کا اظہار انوکھے انداز میں کر رہا ہے۔ یعنی میدان جنگ میں ایک پیاسا تشنہ لب بادشاہ آیا ہے اور پھر پیاسا بادشاہ بھی وہ جس کا کڑیل جوان بیٹا ابھی ابھی شہید کیا گیا ہے۔ لہٰذا انسانی نفسیات کے پیش نظر امام حسین کے صبر کا پیالہ ایک طرح بھر چکا ہے انہوں نے اب تک بہت ضبط کیا۔ ''اب تک اسے آیا تھا نہ غصہ، پر اب آیا''۔ لیکن اب ضبط کا یارا نہیں۔ فوج دشمن کا اندازہ غلط تھا کہ کڑیل جوان بیٹے کے غم میں اب حسین سے کچھ نہیں ہو سکے گا۔ ''اب رو کے کوئی سبطِ رسول عربی کو''۔ اس مصرع میں امام حسین رضی اللہ عنہ کی نفسیاتی کیفیت میں روحانی کیفیت بھی شامل ہو جاتی ہے اور اسی لیے امام کی طاقت کا اس وقت اندازہ لگانا کوئی آسان کام نہیں۔ ظلم کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اب اپنے تمام لہولہان

جسم کے باوجود امام عالی مقام لڑ کر دکھائیں گے اور امام مظلوم نے اپنے تن پاش پاش کے باوجود اور خون میں ڈوبے ہوئے ہونے کے باوجود خوب جنگ کی۔ یہ امام غریب کی جنگ تھی۔ تمام عزیز و رفقا کے مرنے کے بعد کی جنگ۔ لیکن امام مظلوم فرما رہے تھے:۔

پر غم نہیں کچھ پاس نہ ہونے سے کسی کے
اللہ تو ہے سر پہ حسین ابن علی کے

اگلا بند اس طرح شروع ہوتا ہے:

گو خشک دہن میں ہے زباں تشنہ لبی سے　　بندہ وہ جسے کام ہو خالق کی خوشی سے
پھر جائے اگر سارا جہاں سبطِ نبی سے　　نومید نہ ہوں ذات جناب احدی سے
تنہا مرے ہونے میں کچھ اسرار نہاں ہے
وہ خوب سمجھتا ہے مجھے فہم کہاں ہے

اب یہ مادی غربت کے ساتھ ساتھ روحانی غربت کا عالم ہے جس کے زور پر امام عالی مقام فرما رہے ہیں:

پھر جائے اگر سارا جہاں سبطِ نبی سے　　نومید نہ ہوں ذات جناب احدی سے

عام غربت کیا چیز ہے۔ امام مظلوم تو غربت کی انتہا کو بھی اس وقت نظر میں نہیں لا رہے ہیں۔ سارا جہاں بھی اگر امام کو چھوڑ دے اور انہیں غریب کر دے تو امام کو کوئی پروا نہیں، کیونکہ امام کو یقین ہے کہ حقیقت عظمیٰ ان کے ساتھ ہے اور اسی رفاقت کے باعث وہ اپنے امام ہونے پر اپنی ذات میں بلا کی توانائی محسوس کرتے ہیں۔

بابا کی طرح مجھ میں بھی ہے زور امامت

اور اسی زور کی بنا پر دشمنوں سے کہہ رہے ہیں:۔

اک پل میں اگر چاہوں تو کر دوں تمہیں غارت

اس بند کی بیت میں اللہ کے حوالے سے بات کر رہے ہیں:۔

آج اس کے کرم سے بھی مقدور ہے مجھ کو
پر اس کی جو مرضی وہی منظور ہے مجھ کو

اور اس سے آگے کے بند کی بیت:

تنہائی میں بھی تابع مرضی خدا ہوں
نانا تھے فدا مجھ پہ میں امت پہ فدا ہوں

امام عالی مقام پہلی بیت میں فرما رہے ہیں کہ ہزار غربت کے باوجود مجھ میں ہر طرح کا مقدور ہے۔ میں جو چاہوں وہ کر سکتا ہوں لیکن مجھے تو خدا کی مرضی اور خدا کی خوشی مطلوب ہے۔ میں نے اپنے آپ کو اپنی ذات کے جملہ امکانات کو حقیقت عظمیٰ پر چھوڑ رکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ سے لو لگانے کے بعد آدمی کسی طرح بھی غریب نہیں رہ جاتا۔ اس کا خواہ دنیا میں کوئی نہ ہو خدا تو ہوتا ہے اور اتنا بڑا سہارا ہے کہ پھر کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس لیے اگلے بند کی بیت میں فرما رہے ہیں۔

مجھ پر ہزار غربت کا عالم گزرے میں چاہے کتنا بھی تنہا ہو جاؤں لیکن اگر مرضی خدا میرے ساتھ ہے تو مرضی خدا کا تابع ہونا ہر طرح کی غربت کو دور کر دیتا ہے اور میں ویسے بھی کیسے غریب کہلا سکتا ہوں جبکہ نانا نے میرے ساتھ محبت کی ہے اور مجھے نانا کی امت سے محبت ہے اور میں اسی محبت میں اپنے نانا کی امت پر قربان ہو رہا ہوں، گویا ایثار و قربانی تو انسان کی بڑی سے بڑی غربت کو دور کر دیتی ہے۔ امت کو میرا خیال نہ بھی ہو تو یک طرفہ محبت بھی اپنا کام کر جاتی ہے۔ کیونکہ جذبۂ محبت اتنا بڑا ساتھی ہے کہ اس کی رفاقت کے بعد کسی دوسری رفاقت کی ضرورت نہیں رہتی۔ غرض انیس نے اپنے مراثی میں غربت کے ایسے ایسے پہلو دکھائے ہیں کہ جن کو دیکھ کر جدید عمرانیات کے بہت سے مسائل نہ صرف حل ہوتے محسوس ہوتے ہیں بلکہ ان مسائل سے انسانی معاشرے کی نصیب بھی جاگتے نظر آتے ہیں۔

دراصل اس طرح کہ غربت میں جو حقیقت عظمیٰ سے تعلق پیدا ہونے کے باعث ایک طاقت اور توانائی پیدا ہوتی ہے، اس کے امکانات کا احاطہ کرنا آسان نہیں۔ مگر چونکہ امام مظلوم تو ایک راہنما اور ہادی تھے اس لیے انہیں ان امکانات کا پورا پورا اندازہ تھا۔ جس کے زور پر وہ اپنی غربت بڑے تیقن کے ساتھ سنبھالے ہوئے تھے۔ اور امام کا اپنی غربت کو سنبھالنا ایسا تھا جیسے وہ اسلام کے مستقبل کو سنبھالے ہوئے تھے۔ اور حقیقت میں ایسا ہی ہوا آج بھی امام عالی کی غربت کے سہارے ہم لوگ اپنے قدم راہ انسانیت میں بہت آگے بڑھا سکتے ہیں۔ جی ہاں ہم اس طرح اس غربت سے آگے قدم بڑھا سکتے ہیں جس کا ذکر میر انیس نے اپنے زیر بحث شعر میں کیا ہے۔ میں وہ شعر پھر لکھ دیتا ہوں۔

غربت میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا
شمعیں بھی جلاؤ تو اجالا نہیں ہوتا

مطبوعات قائداعظم لائبریری

(مقالات)

۱۔	اسلام کا تصور خودی	محمد سعد صدیقی
۲۔	اسلامی مملکت میں قیام امن	محمد سعد صدیقی
۳۔	اسلامی نظام تعلیم	محمد سعد صدیقی
۴۔	جہانے را دگر گوں کرد یک مرد خود آگاہے	سید عبدالرحمٰن بخاری
۵۔	ضابطۂ اخلاق برائے طلبا و اساتذہ	محمد سعد صدیقی
۶۔	عمل حدیث میں جرح و تعدیل	محمد سعد صدیقی
۷۔	نظام حکومت قرآن و سنت کی روشنی میں	محمد سعد صدیقی
۸۔	ہمارے دینی کتب خانے	محمد سعد صدیقی
۹۔	الکاسانی۔ حیات و خدمات	سید عبدالرحمٰن بخاری

مولانا حسرت موہانی کی دیباچہ نگاری

شفقت رضوی

مولانا حسرت موہانی ان مسلم اکابرین میں شامل ہیں جو وقت اور حرف کی حرمت سے بخوبی واقف تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ ان میں سے کسی کا معمولی زیاں بھی روز حشر مواخذہ کا سبب بنے گا۔ انہوں نے ایک ایک لمحہ اور ایک ایک حرف کو ذات کے اظہار، دوسروں کی خدمت اور عمل نیک کے لیے وقف رکھا۔ انہوں نے اپنے پندرہ دواوین (۱۳ دیوان، ۲ ضمیمہ) مرتب کیے۔ رسالہ اردوئے معلیٰ ۱۹۰۳ء سے ۱۹۴۲ء تک (متعدد مختصر اور طویل تعطل کے ساتھ) جاری رکھا۔ اساتذہ سخن کے ڈھائی سو سے زائد دواوین بعد تلاش بسیار بصورت مخطوطہ یا مطبوعہ برآمد کیے۔ ان میں سے بعض کو مکمل طور پر اور بعض کو انتخاب کلام کی صورت میں شائع کیا۔ سہ ماہی کتابی سلسلہ ''تذکرۃ الشعرا'' جاری کیا۔ اخبار مستقل کی ادارت فرمائی جس کے ذریعے سے اپنے سیاسی رجحانات نظریات اور فلسفہ کی ترجمانی کی۔ مسلم صحافت میں یہ سب سے بے باک سمجھا جاتا تھا۔ حکومت کے خلاف تو کم یا زیادہ سب ہی لکھتے تھے لیکن اس وقت (۱۹۲۰ء کی دہائی کے آخری سالوں میں) جب کانگریس اور گاندھی جی کا سیاسی اقبال بام عروج پر تھا انہوں نے اخبار مستقل میں دونوں کے خلاف نہایت تند و تیز مضامین لکھے۔ ان تمام کے علاوہ وہ متعدد کتابوں کے طابع و ناشر تھے۔ واقعہ یہی ہے کہ انہوں نے علمی، ادبی اور سیاسی شعبوں میں بالکل تنہا (اور کسی قدر بیگم حسرت کی معیت میں) ایسے کام انجام دیے کہ جو گہرائی اور گیرائی کی بنا پر آپ اپنی نظیر ہیں۔ ان کے انجام دیے ہوئے کاموں کی مجموعی کمیت اور کیفیت اتنی ہے کہ آج بڑی سی بڑی مالی امداد حاصل کرنے والے ان سے کندھا ملانے کی جسارت نہیں کر سکتے۔

مولانا حسرت موہانی کو بعض دیگر مسلم اکابرین کی طرح فراموش بھی نہیں کر دیا گیا ہے۔ ان پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے متعدد مقالات لکھے جا چکے ہیں۔ معیاری اور مقتدر رسائل کے ضخیم و وقیع حسرت نمبر نکل چکے ہیں۔ حسرت پر لکھے گئے مضامین کے انبار لگے ہیں۔ ان کے باوجود حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ جو کچھ لکھا گیا اس میں تحقیق کا حق ادا نہیں کیا ہے۔ کام غیر مستند واقعات سے چلا لیا جاتا ہے۔ ایک ہی بات کی سینکڑوں بار تکرار کی جا چکی ہے۔ عام رویہ یہ ہے کہ چار کتابیں سامنے رکھ کر پانچویں تیار کر لو۔ گم شدہ گوشوں تک پہنچنا کارِ اطفال نہیں۔ اس لیے یہ گوشے چھپے پڑے ہیں چند دن جاتے ہیں کہ لوگ ان کو سرے سے بھول جائیں گے۔

مولانا حسرت موہانی کو ایک دنیا شاعر اور سیاست دان کی حیثیت سے جانتی ہے۔ ان کے اور بھی کئی روپ ہیں۔ ہماری نگاہوں کی کم حوصلگی ان تک پہنچ نہیں پاتی۔ وہ زبان کے نبض شناس تھے۔ قواعد صرف و نحو پر عبور حاصل تھا گویا ماہر لسانیات تھے۔ انہوں نے متروکات سخن، معائب سخن، محاسن سخن پر جس انداز کی روشنی ڈالی ہے اس سے ان کے وسیع مطالعے کے علاوہ ان کے

قوت فیصلہ کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ پایہ کے نثر نگار تھے۔ ان کا تعلق سرسید کے دبستان نثر سے تھا۔ وہ بالغ النظر نقاد تھے۔ ان کے تنقیدی خیالات مغرب سے مانگے ہوئے خام خیالات پر موقوف نہ تھے بلکہ ان کے اپنے تھے، ان کے طویل مطالعہ اور تجزیہ کا حاصل۔ وہ ایک تذکرہ نگار تھے انہوں نے تقریباً ۱۱۸ شعرا پر طویل یا مختصر مضامین لکھے۔ ان کے سیاسی مضامین جو اردوئے معلی اور اخبار مستقل میں محفوظ ہیں، سینکڑوں کی تعداد میں ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ حسرت کی سیاست پر تو مضامین لکھے گئے لیکن ان کے اپنے مضامین کے حوالے کہیں نہیں ملتے۔

اتنے سارے کام وہی کر سکتا ہے جس نے زندگی کے کسی لمحہ کو ضائع نہ کیا ''فرصت یک پل'' بھی جس پر حرام ہو۔

مولانا حسرت موہانی کی نثری تحریروں تک عام طور پر لوگوں کی نظریں نہیں پہنچتی ہیں اسی طرح ان کی دیباچہ نگاری کے نمونے بھی دسترس سے باہر ہیں۔ ان کے دیباچوں کی تعداد بمشکل ایک درجن ہے ان میں سے دو کے سوا باقی سب بہت مختصر ہیں انہیں اندازہ تھا طویل الکلامی ہنر نہیں۔ مافی الضمیر کو کم سے کم الفاظ میں بھرپور طریقے سے ادا کرنے کے وہ ماہر تھے وہ اپنے علم کو ''حرفے چند'' تک محدود سمجھتے تھے اس لیے دیباچوں میں ہمہ دانی دکھلانے کے لیے ہیجانی کیفیت نہ خود پر طاری کرتے اور نہ پڑھنے والوں پر۔ دیباچے چاہے مختصر ہوں یا طویل وہ ہیں بامقصد ممکن تھا کہ دیباچہ کے بغیر کتاب کو سمجھ لیا جاتا لیکن قاری کو متعلقات کے بغیر تشنگی محسوس ہوئی۔ قاری کی تشنگی کا احساس کرتے ہوئے اسی قدر قطرے دیباچہ میں استعمال کیے جاتے۔

دیباچہ دیوان غالب مع شرح:

مولانا حسرت موہانی کے لکھے ہوئے جو دیباچے اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں ان میں ''دیباچہ دیوان غالب مع شرح'' کو تقدم حاصل ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مولانا کی آمدنی کا ذریعہ رسالہ اردوئے معلی اور اشاعت کتب تھے۔ انہوں نے ۱۹۰۳ء میں ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ سے بی۔اے کیا اور آبائی وطن موہانی کی سکونت ترک کر کے علی گڑھ ہی میں رہنے لگے۔ وہیں سے جولائی ۱۹۰۳ء میں رسالہ جاری کیا۔ وہیں سے اشاعت کتب کا سلسلہ بھی شروع کیا جو اولین کتابیں انہوں نے شائع کیں ان میں ''دیوان غالب مع شرح'' بھی ہے۔ اس میں انہوں نے دو باتوں کی وضاحت کے لیے دیباچہ لکھا اسباب تالیف اور طریق شرح۔ سبب تالیف میں بعض باتیں ضمناً ایسی آ گئی ہیں جن میں معلوم ہوتا ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں ان کی زائد از نصاب مصروفیت کیا رہتی تھی۔ ان کے سوانح نگار کے لیے یہ معلومات اہم ہیں۔ چنانچہ ''سبب تالیف'' کی ذیلی سرخی کے تحت وہ لکھتے ہیں:

> ''جس زمانہ میں راقم الحروف علی گڑھ کالج میں تعلیم پاتا تھا[۲]۔ وہاں اردوئے معلی کے نام سے ایک مفید علمی انجمن قائم تھی[۳] جس میں کالج کے باذوق طالب علم مختلف علمی مسائل پر عموماً اور اساتذہ اردو کے کلام پر خصوصاً مضامین لکھا کرتے تھے۔ انجمن مذکور کے اکثر اعضا ایسے بھی تھے جو بربنائے شوق وزندہ دلی جلسہ ہائے انجمن میں وقت مقررہ سے پہلے پہنچ جاتے تھے اور آغاز جلسہ تک غالب کے مشکل اور نازک اشعار کے معانی ومطالب کی نسبت بحث ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ راقم کو بھی حل دیوان غالب کا خیال اسی ذریعہ سے پیدا ہوا۔ اگرچہ بوجوہ چند در چند اس انجمن کا وجود قائم نہ تھا اور اکثر احباب کا زمانہ قیام کالج بھی ختم ہو گیا۔

غرضیکہ وہ محفل بھی برہم ہو گئی لیکن راقم کے دل میں شرح دیوان غالب کا خیال قائم رہا۔ کچھ دنوں میں پورے دیوان کی شرح تیار ہو گئی''۔

حسرت نے شرح بہتر علمی استعداد رکھنے والوں اور سوجھ بوجھ رکھنے والوں کے لیے لکھی تھی اس لیے حد درجہ اختصار سے کام لیا ہے اپنے طریق کی وضاحت کے ضمن میں انہوں نے لکھا:

> ''بعض احباب کی یہ رائے تھی کہ پہلے دیوان ہو اس کے بعد شرح۔ لیکن راقم نے بخیال آسانی ناظرین اس طریق کو ترجیح دی کہ ہر غزل کے ساتھ اس کے مشکل اشعار کا مطلب درج کر دیا جائے تاکہ بار بار ورق الٹنے کی زحمت نہ اٹھانا پڑے۔ ادائے مطالب اشعار میں سب سے زیادہ لحاظ اختصار اور سادگی کا رکھا گیا ہے یعنی جہاں تک ہو سکا ہے شعر کا صرف ایک مفہوم مختصر عبارت میں صاف صاف لکھ دیا ہے۔ مشکل الفاظ کے لغوی معنی لکھنے کے بجائے اشعار کی شرح کے ضمن میں اس طرح ادا کر دیے کہ قلیل تامل سے خود بخود واضح ہو جائیں۔ مبتدیوں کے لیے یہ اختصار شاید نامناسب ثابت ہو۔ لیکن راقم نے محض مبتدیوں کے خیال سے کتاب کی طوالت کو جائز نہ رکھا''[۵]۔

حسرت موہانی سے قبل بھی دیوان غالب کی متعدد شرحیں لکھی گئی تھیں۔ وہ سب ان کے پیش نظر رہیں بلکہ ان سے استفادہ بھی کیا۔ یہ ان کی شرافت نفس ہے کہ انہوں نے شوکت میرٹھی، والہ حیدرآبادی، الطاف حسین حالی اور سید علی حیدر نظم طباطبائی کے نام احترام سے لیتے ہوئے ان سب سے مستفیض ہونے پر اظہار تشکر کیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی کالج کے قدیم طالب علموں کا بھی شکریہ ادا کیا جو اتفاقیہ طور پر ۱۹۰۴ء میں علی گڑھ میں جمع ہو گئے تھے۔ حسرت کی اکثر شامیں ان کے ساتھ گزرتی تھیں۔ اس بارے میں انہوں نے لکھا ہے:

> ''راقم الحروف نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اکثر شام کی نشستوں میں اپنی تحریر کردہ شرح بھی سنانا شروع کی اور اکثر موقعوں پر اپنے محترم دوستوں مثلاً قاضی شمس الضحیٰ صاحب اخگر بی۔اے پروفیسر ظریف محمد صاحب ایم۔اے حاجی محمد خاں صاحب بی۔اے، محمد حامد صاحب بی۔اے ڈپٹی کلکٹر رانچی، مرزا محمد اکرم صاحب بی۔اے، ڈپٹی کلکٹر سیونی کے مشورہ صائب اور نکتہ چینی دوست سے بہت فائدہ اٹھایا''[۶]۔

اس نوع کی تالیفات متعدد اہل علم کی معاونت کے بغیر مکمل نہیں ہوتیں۔ جن سے تعاون اور امداد حاصل ہو ان کا شکریہ ادا کرنا اخلاقی فرض ہوتا ہے اس کا رواج اخلاقی انحطاط کی وجہ سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ حسرت کی تحریر نے بالواسطہ طور پر اخلاقی تربیت کا اہتمام کیا ہے کہ جس سے کام لو اس کو فراموش نہ کرو۔

''دیوان غالب مع شرح'' کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے دوسرے ایڈیشن میں انہوں نے خصوصیت سے محمد فاروق صاحب دیوانہ گورکھ پوری کا شکریہ ادا کیا، جنہوں نے ایک خاص تنقیدی مضمون کے ذریعے سے ترمیم شرح ونظر ثانی کی جانب توجہ دلا کر حسرت کو ممنون احسان کیا۔

۲۔ دیباچہ گلدستہ حسرت:

حسرت موہانی کے لکھے ہوئے دیباچوں میں سب سے طویل دیباچہ ''گلدستہ حسرت'' کا ہے۔ بہت کم اہل علم اس بات سے واقف ہیں کہ حسرت کا پہلا مجموعہ کلام ''گلدستہ حسرت'' ہے تھا جو ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں وہ غزلیں شامل ہیں جو انہوں نے قید فرنگ اولی کے زمانہ میں (دوران ۲۳ جون ۱۹۰۸ء تا ۳ جولائی ۱۹۰۹ء) کہی تھیں۔ دیباچہ کی اہمیت تاریخی اور ادبی دونوں اعتبار سے ہے۔ انہوں نے اسیری کی وجہ، مقدمہ کی کارروائی، انصاف کا کھلے بندوں خون جیسے موضوعات کو ذاتی تجربوں کے حوالے سے چھیڑ کر بدیسی حکومت کی بدنیتیوں اور بداعمالیوں کی تفصیل دی ہے۔ جیل میں ان کے ساتھ عادی مجرموں سے بدتر سلوک کرنے کی روداد ہے اور لکھنے پڑھنے کی ممانعت کے باوجود روزانہ ایک من گیہوں چکی میں پیستے ہوئے مشق سخن جاری رکھنے کی کاوش کا ذکر کیا ہے۔ ہم یہاں گلدستہ حسرت میں شامل غزلوں کے حوالے سے ان کی بیان کردہ تفصیلات پیش کرتے ہیں:

> ''تمام مذکورہ بالا موانعات کے باوجود یہ کل غزلیں دن بھر چکی پیسنے کے اثنا میں کہی جاتی تھیں اور بوقت شام ایک قیدی دوست کو لکھوا دی جاتی تھیں جو بحیثیت برقنداز نسبتاً آزاد تھے اور مخصوص طور پر زیر نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے کاغذ پنسل بھی اپنے پاس چھپا کر رکھ سکتے تھے۔ راقم کی رہائی کے کچھ ہی عرصہ بعد وہ دوست بھی رہا ہوئے اور ان چند غزلوں کے سوا جو کسی طرح ضائع ہو گئیں باقی کل غزلیں ان سے دستیاب ہو گئیں۔ ابتدا میں صرف چند متفرق غزلیں لکھی گئی تھیں لیکن میر مظفر حسین صاحب فوق متوطن ضلع بجنور کے اصرار سے (جو خود بھی الہ آباد جیل میں قید تھے اور اب رہا ہو گئے ہیں) کل ردیفوں میں غزلیں تیار کی گئیں اور اس طرح ایک مختصر سا دیوان مرتب ہو گیا۔ فقیر کی لاابالی طبیعت سے ایسی پابندی کی امید نہ تھی اس لیے میر صاحب موصوف کا اصرار خاص شکریہ کا مستحق ہے''۸۔

یہاں اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ دیباچے کے اختتام پر حسرت موہانی نے اپنے فلسفہ حیات کو دو اشعار میں بیان کر دیا ہے اور یہ اشعار ان کے کسی دیوان میں شامل نہیں ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ عمر دو روزہ تری خواہش میں کٹے — یا احمد رسل کی ستایش میں کٹے
ان ہر دو فرائض کے علاوہ یا رب — حریت و حسن کی بنایش میں کٹے

۳۔ دیباچہ انتخاب دیوان حسرت:

حسرت موہانی نے اپنے تمام دواوین پر باقاعدہ ''دیباچے'' نہیں لکھے البتہ ہر دیوان کے سرورق پر صراحت کر دی ہے کہ اس میں کس زمانہ کی غزلیں شامل ہیں۔ ان کا پہلا دیوان وہ ہے جسے انہوں نے خود مرتب کیا تھا لیکن چونکہ اس میں ۱۹۰۳ء سے قبل کی غزلیں شامل نہیں کی تھیں اس لیے اسے ''دیوان'' کہنے کے بجائے ''انتخاب دیوان'' کا نام دیا گیا۔ اس کی اشاعت ۱۹۱۳ء کے اواخر میں ہوئی۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ قریبی زمانہ میں (۱۹۱۴ء میں) یہی دیوان الناظر پریس میں ''دیوان حسرت حصہ اول'' کے عنوان سے چھپا۔ ان دونوں کے درمیان کہیں کہیں معمولی سا لفظی اختلاف ہے۔ دیوان مطبوعہ الناظر پریس لکھنو میں کوئی دیباچہ بھی نہیں ہے۔ دیوان مطبوعہ علی گڑھ میں دیباچہ ہے جس میں ان تمام دشواریوں کا ذکر کیا گیا ہے جو اس کی اشاعت میں قدم قدم پر مانع رہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مدت سے اس فقیر کے اکثر احباب اور اعزہ خصوصاً مولوی سید حیات الحسن صاحب رضوی موہانی عہدہ دار سرکار نظام کا تقاضہ تھا کہ دیوان حسرت کے طبع و نشر کا انتظام کیا جائے بلکہ جناب موصوف نے ترتیب دیوان کی زحمت کو بھی بکمال مرحمت اپنے ذمہ لے لینا منظور فرمایا تھا لیکن ۱۸۹۲ء سے ۱۹۰۳ء تک یعنی زمانہ طالب علمی موہان، فتح پور، علی گڑھ کا کلام جس میں غزلوں کے علاوہ قصیدے اور مثنویاں اور بہت سی انگریزی نظموں کے ترجمے بھی شامل تھے نظر ثانی کے محتاج اور فرصت کامل کے طالب تھے جس کے حصول کی فی الحال کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ ناچار مکمل مجموعہ کلام کی ترتیب کو ملتوی کر کے صرف ان غزلوں کی اشاعت پر قناعت کرنا پڑی جو اردوئے معلی یا دوسرے ادبی رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔ اس مختصر مجموعہ کے تین جز اردو پریس علی گڑھ میں چھپ چکے تھے کہ پریس ایکٹ کی سختی نے اس کا خاتمہ کر دیا۹۔ چنانچہ آخری کاپی اور سرورق مطبع فیض عام میں چھپوا دیئے گئے۔ کتاب میں ہجوم افکار کی بنا پر باوجود احتیاط بعض معمولی غلطیاں باقی رہ گئی ہیں''۱۰۔

اپنے دیگر دواوین پر انہوں نے دیباچے نہیں لکھے البتہ ہر ایک کے سرورق پر ایک دو جملے ایسے ضرور لکھ دیئے ہیں کہ جن سے غزلیات کہی جانے کی مدت یا تاریخیں معلوم ہوں۔ وہ اس قسم کا اہتمام اس لیے کرتے تھے کہ انہیں گمان تھا آنیوالے زمانے میں ایسے صاحب نظر مبصر اور نقاد پیدا ہوں گے جو ان کے کلام کا تاریخی ترتیب میں مطالعہ اور تجزیہ کر کے تعین کر سکیں گے کہ کلام کے ارتقا اور زوال کی نشان دہی ہو سکے لیکن ابھی تک اس نقطہ نظر سے ان کے کلام کے مطالعے کی کسی نے زحمت نہیں کی۔

ان کے دیوان حصہ پنجم، ششم، اور ہفتم میں دیباچے شامل ہیں جو مختصر ہونے کے باوجود معلوماتی ہیں۔ انہیں ترتیب وار درج کیا جاتا ہے:

دیباچہ دیوان حسرت حصہ پنجم:۔ ''یہ حصہ ان غزلوں کا مجموعہ ہے جو قید فرنگ ثانی کے بعد بہ اوقات مختلف ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۱ء تک کنھور، میرٹھ، علی گڑھ اور کانپور میں لکھی گئیں۔ اس مجموعے میں قید فرنگ ثالث (جو اپریل ۱۹۲۳ء سے شروع ہو کر اس وقت تک جاری ہے کی وہ کل غزلیں شامل ہیں جو سابرمتی، احمد آباد، گجرات میں لکھی گئیں۔ یہ مجموعہ بہ غرض اشاعت سنٹرل خلافت کمیٹی بمبئی کے سپرد کر دیا گیا تھا مگر معلوم نہیں کس سبب سے اب تک اس کے شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی''۔

دیباچہ دیوان حسرت حصہ ششم:۔ ''فقیر نے یہ کل اور ان کے علاوہ اور بھی متعدد غزلیں اکتوبر ۱۹۲۲ء میں مرتب کر کے سابرمتی جیل سے بدشواری تمام کسی نہ کسی طرح پر کارکنان سنٹرل خلافت کمیٹی کو بغرض اشاعت بھجوا دی تھیں مگر اب معلوم ہوا کہ انہوں نے

از راہ کمال قدر دانی اشاعت کے بجائے ان کو خدا جانے کہاں گم کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، مجبوراً جو کچھ دوبارہ فراہم ہو سکا یا یاد آ سکا اس حصے میں درج کر دیا گیا جو کچھ رہ گیا اس کے لیے مشتاقان سخن کا رکنان خلافت کو دعائے خیر سے یاد کریں''۔ (فقیر حسرت موہانی ۲۶ نومبر ۱۹۲۳ء سنٹرل جیل یروداٰ)

دیباچہ دیوان حسرت حصہ ہفتم:۔ یہ مجموعہ غزلیات جو دیوان حسرت کا ساتواں حصہ ہے اس کی بعض خصوصیات قابل لحاظ ہیں۔ مثلاً اس کی تصنیف میں کل گیارہ دن صرف ہوئے ہیں۔ جن جن بزرگوں سے فقیر کو فیض پہنچا ان میں سے اکثر کی جانب اس مجموعہ میں کہیں نہ کہیں اشارہ موجود ہے۔ بزرگان دین اسلام کے علاوہ ایک موقع پر سری کرشن کا بھی نام آیا؟ حضرت سری کرشن علیہ الرحمۃ کے باب میں فقیر اپنے پیر اور پیروں کے پیر حضرت سید عبدالرزاق بانسوی قدس اللہ سرہ کے مسلک عاشقی کا پیرو ہے:

مسلک عشق ہے پرستش حسن
ہم نہیں جانتے عذاب و ثواب

یہ کل غزلیں اس زمانہ میں لکھی گئیں جب کہ فقیر پر حکومت کی جانب سے ایک دوسرا مقدمہ چلایا جا رہا تھا مگر اس کے سبب سے انشاء اللہ تعالیٰ کہیں پریشانی خیال کے نمونے نظر نہ آئیں گے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

دیباچہ دیوان اشرف کسمنڈوی:۔ اشرف علی اشرف کسمنڈوی اور حسرت موہانی ایک ہی استاد تسلیم لکھنوی کے شاگرد تھے۔ حسرت نے جب غیر مطبوعہ دواوین کی اشاعت کا منصوبہ بنایا تو مخطوطات کی دریافت اور حصول میں ناگفتہ بہ حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے اشرف کسمنڈوی کا دیوان تو بمشکل حاصل کر لیا لیکن اس میں شاعر کی مرضی یہ تھی کہ بغیر کسی استاد سخن کی نظر ثانی کے کلام کو شائع نہ کیا جائے۔ بہر حال جہاں تک حد امکان میں تھا انہوں نے خود نظر ثانی کر کے اپنے ایک مرحوم دوست کی نشانی کو حیات جاوید عطا کی۔ دیوان اشرف کی اشاعت کے لیے ان کو کن مراحل سے گزرنا پڑا اس کا اجمالاً ذکر اس کے دیباچہ میں یوں کیا ہے:

''منشی اشرف علی مرحوم اشرف کے دو دیوان عرصے سے ان کے بھائی صاحب کے پاس موجود تھے جن کی زیارت سب سے پہلے راقم الحروف کو ۱۹۰۲ء میں ہوئی تھی لیکن ان کے طبع ہونے کی اس وقت تک کوئی صورت نہیں نکلی تھی۔ اول تو اس لیے کہ اخراجات طبع کا انتظام مشکل تھا دوم زیادہ تر اس باعث سے کہ منشی صاحب اپنے زمانہ حیات میں بر بنائے انکسار ہمیشہ ہی کہتے رہے کہ جب تک یہ مجموعہ کسی باخبر شاعر کی نظر سے گزر نہ جائے اس کا چھپنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ مرحوم کی نظر میں اس کام کے لیے استاذی حضرت تسلیم سے بہتر اور کوئی شخص موجود نہ تھا چنانچہ استاد مرحوم نے بھی کئی بار اس پر آمادگی ظاہر فرمائی لیکن بوجوہات چند کبھی اس کی نوبت نہ آ سکی۔ یہاں تک کہ ایک ناچیز متوسل ہونے کی حیثیت سے مجھے یہ امر کسی طرح گوارا نہ ہوا کہ دیوان اشرف گوشہ گمنامی میں پڑا رہے۔ کلام اشرف کو بنظر تصحیح دیکھنا تسلیم کے ایک شاگرد کا کام نہ تھا اس لیے مجبوراً انتخاب اشعار کا طریقہ اختیار کرنا پڑا۔ تاہم جہاں جہاں کتابت یا شاعری کی صریح غلطیاں یا

کمزوریاں نظر آئیں ان کو کاتب کی خطا پر محمول کر کے مناسب تبدیلی بے شک کر دی گئی ہے''۱۱۔

دیباچہ ''تذکرۃ الشعرا:۔ رسالہ اردوئے معلیٰ کی مئی ۱۹۱۳ء میں بندش کے بعد ایک سہ ماہی کتابی سلسلہ ''تذکرۃ الشعرا'' کے نام سے شروع ہوا۔ اس سلسلہ کی پہلی کتاب جولائی ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئی۔ حسرت نے اس کے اجرا کے وجوہ اور مقاصد کا تفصیلی احوال اس کے دیباچہ میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''مئی ۱۹۱۳ء میں حکومت نے اردو پریس سے ۳۰۰۰ کی ضمانت طلب کی جو ادا نہیں کی گئی اس لیے اردو پریس کا خاتمہ ہو گیا اور اس کے ساتھ اردوئے معلیٰ بھی بند ہو گیا۔ سیاسی حیثیت سے اردوئے معلیٰ اپنا فرض ادا کر چکا۔ اس کا اظہار آخری رسالہ میں بھی ہو چکا ہے البتہ ادبی حیثیت سے اس کے بہت سے مقاصد ناتمام رہ گئے تھے جن کی تکمیل کے لیے یہ تذکرہ کتابی صورت میں شائع کیا جاتا۔ فی الحال اس کتاب کے ہر سال چار جزو اور ہر جزو میں کم سے کم ۱۰۰ صفحے شائع ہوا کریں گے اور ہر چہارا جزا کی پیشگی قیمت مع محصول لی جائے گی''۔

ہر جزو میں کچھ حصہ تذکرۃ الشعرا کا ہو گا باقی اوراق میں کلام اساتذہ کا انتخاب ہو گا جن کا بیشتر حصہ اس وقت تک غیر مطبوعہ اور کمیاب ہے۔ امید ہے کہ ناظرین اس تلاش اور کاوش کی داد دے کر ہماری ہمت افزائی فرمائیں گے۔

سلسلہ شاہ حاتم کے بہت سے شاعروں کا حال اردوئے معلیٰ میں شائع ہو چکا ہے۔ جتنے باقی ہیں ان کا تذکرہ اس کتاب میں شائع ہو گا۔ انتخاب دواوین کے لیے سلسلہ مصحفی سے ابتدا کی جاتی ہے چنانچہ پہلے جزو میں اسیر، تنہا و شہیدی کے دیوان شائع کیے جاتے ہیں اور جزو دوم میں مخمور و مسرور و عیشی شاگردان مصحفی کے دیوان چھاپے جائیں گے۔ قدر دان فن کو معلوم ہونا چاہیے ان دواوین میں سے اکثر دیوان قلمی اور کمیاب بلکہ نایاب ہیں اور اب بہ صرف کثیر و سعی بلیغ ان کو کسی نہ کسی طرح سے حاصل کیا اور اب محض اردو ادب کی خدمت کے لحاظ سے اس کا انتخاب شائع کیے دیتے ہیں۔

انتخاب دواوین کے علاوہ اس کتاب میں کبھی کبھی ادبی مضامین اور موجودہ شعرائے نام آور کی اردو غزلیں بھی شائع ہوا کریں گی۔ غرض کہ کتاب کو ہر طرح دلچسپ بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ وما توفیقی الا باللہ''۱۲۔

دیباچہ نکات سخن:۔ نکات سخن حسرت موہانی کی معرکہ آرا تالیف ہے اور اپنی نوعیت مضامین کے لحاظ سے منفرد ہے۔ حسرت کا فارسی اور اردو ادبیات بالخصوص شاعری کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ ان کے مطالعہ کی صفت غور و خوض بھی تھی۔ وہ ایک ایک شعر کو لفظی اور معنوی حسن و قبیح کے لحاظ سے جانچتے اور بر بنائے حسن اس کی تعریف ضرور کرتے۔ اردو شاعری کے عام رواج پانے اور عہد قدیم کے استادی شاگردی کے رشتے کے معدوم ہوتے جانے کی وجہ سے انہیں خیال ہوا کہ نو آموز اور نو مشق شعرا کی رہنمائی کے لیے خصوصاً ایسی کتاب تیار کی جائے جو زبان اور بیان کے معاملے میں رہنمائی کر سکے چنانچہ اپنے چالیس سالہ مطالعہ اور تجزیے کو ''نکات سخن'' میں پیش کیا ہے اس کے ۱۳ ابواب ہیں (۱) متروکات سخن (۲) معائب سخن (۳) محاسن سخن۔ وہ چوتھا باب اصلاح سخن

بھی تحریر کرنا چاہتے تھے جو ان کے لیے ممکن نہ ہوا۔ اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ بطور مثال سینکڑوں شعر درج کر دیے ہیں۔ یہ اس دور میں تحریر کی گئی جب حسرت قید فرنگ ثانی و ثالث کی صعوبتیں للت پور، جھانسی، پرتاب گڑھ، فیض آباد، لکھنو، میرٹھ، برسٹی اور بردوان کی جیلوں میں بھگت رہے تھے۔ نکات سخن کے اجزا ابتدا میں اردوئے معلی میں بالاقساط شائع ہوئے اور ۱۹۲۹ء میں یہ بصورت کتاب شائع ہوئے۔

حسرت موہانی نے نکات سخن کے دیباچہ میں کتاب کے موضوع اور اس کی ضرورت واہمیت پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''ایک عرصہ دراز سے راقم حروف کو جہاں اردو زبان کی روز افزوں ترقی اور مذاق صحیح کی جانب نوجوان اردو شاعروں کے قابل قدر رجحان کو دیکھ کر قدرتی طور پر مسرت حاصل ہوتی تھی وہیں اس بات کا افسوس بھی ہوتا تھا کہ دور جدید کے اکثر تعلیم یافتہ شاعر اپنے کلام میں بلندی مضمون و ندرت خیال کے مقابلہ میں زبان و بیان کی خوبیوں کا کافی لحاظ نہیں رکھتے جس کا نتیجہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ اچھے سے اچھا مضمون محض ایک ادنیٰ خرابی کی وجہ سے بے لطف ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس خرابی کی متعدد وجوہ میں سے سب سے بڑا اور پہلا سبب یہ ہے کہ آج کل ماضی کی طرح ذوق شاعری کی ترقی بتدریج نہیں ہوتی بلکہ سوسائٹی میں شعر و شاعری کا پرچا عام نہ ہونے کی بنا پر اکثر قابل طبیعتوں میں مادہ شاعری کا ہیجان دفعتاً ایسی حالت میں پیدا ہوتا ہے جبکہ ان کی دیگر ذہنی اور علمی قابلیتیں پایہ تکمیل کو پہنچ چکی ہوئی ہیں جس کا اثر اکثر اس شکل میں نمودار ہوتا ہے کہ نوجوان شاعروں کو محاسن و صنائع سخن کے فیض صحیح اور کافی اطلاع بطور فرد حاصل کرنے کے لیے ایک عرصہ دراز درکار ہوتا ہے اور اس درمیان میں جو کچھ ان کے قلم سے نکلتا ہے اس میں ان کی جدت ذہن کی خوبیاں ان کی بے مشقی اور ناتجربہ کاری کی بنا پر بالکل خاک میں مل جاتی ہیں۔ زمانہ ماضی میں یہ مرحلہ استاد کی مدد سے بہت جلد اور بڑی آسانی کے ساتھ طے ہو جایا کرتا تھا۔ ناکردہ کار پختہ کاروں کے تجربہ سے فائدہ اٹھا کر وہ مشق سخن جو آج کل کے خود رو شاعر سالہا سال میں حاصل کرتے ہیں، مہینوں بلکہ دنوں میں حاصل کر لیتے تھے''۔

اسی اعتراف کے ساتھ کہ ''راقم حروف کو استادی کا زعم نہیں ہے نہ اس خیال سے یہ کتاب لکھی جاتی ہے کہ کوئی شخص اس کی پیروی استاد کی ہدایتوں کی مانند کرے'' اس کی وجہ تالیف میں لکھا ہے کہ ''منشا صرف اتنا ہے کہ جو تحقیق اور تجربہ راقم کی ۳۰ سال کی تلاش اور کوشش کا نتیجہ ہے اس پر طالبان فن صرف چند ماہ بلکہ چند دن میں حاوی ہو جائیں۔ جو جو بات ان کو پسند آئے اسے قبول کر لیں جو ناپسند ہو اس سے درگزر کر کے راقم کو دعائے خیر سے یاد کریں'' [۱۳]

دیباچہ ارباب سخن:۔ حسرت موہانی نے ایک تذکرۃ الشعرا مرتب کرنے کا قصد کیا تھا اور اس کے سلسلے میں مضامین بھی لکھے۔ ابتدا میں منصوبہ تھا کہ کسی استاد سخن کا حال بیان کر کے ان کے شاگردوں اور پھر شاگردوں کے شاگردوں کا سلسلہ زمانہ حال تک جاری رکھا جائے۔ انہوں نے اس منصوبے کا اعادہ بار بار کیا لیکن ۱۹۲۹ء میں ان کا خیال بدل گیا اور انہوں نے ایک نئے منصوبے کا اعلان کیا۔ اسے بالاقساط اردوئے معلی میں شائع کرنے کے بعد ''ارباب سخن'' کے نام سے کتابی شکل دی۔ اس کتاب کے کئی

حصے ہیں۔ (۱) دیباچہ (۲) شعرا اور ان کے شاگرد (بہ انداز شجرہ) (۳) فہرست شعرا (ہر استاد کے تحت شاگردوں کے نام) (۴) فہرست شعرا بلحاظ حروف تہجی۔ ارباب سخن کے دیباچہ میں حسرت موہانی نے اپنے منصوبے کا خاکہ اس طرح پیش کیا ہے:

''ارباب سخن، اس نام سے ہم شعرائے اردو کا ایک جامع اور مستند تذکرہ لکھنا چاہتے ہیں جس کے مفصلہ پانچ حصے قرار پائیں گے۔

حصہ اول: سلاسل شعرائے اردو، جس میں شعرائے اردو کی ترتیب و تقسیم ان کے سلسلہ شاعری کے اعتبار سے درج کی جائے گی جس کے دیکھنے سے بیک نظر معلوم ہو سکے گا کہ کس شاعر کو کس خاندان سے تعلق ہے۔

حصہ دوم: فہرست شعرائے اردو۔ جس میں مذکورہ بالا سلاسل کے جملہ شاعروں کی ایک مکمل فہرست بقید نام ونشان مرتب کر لی جائے گی۔

حصہ سوم: تذکرہ شعرائے اردو، جس میں قابل ذکر شعرائے اردو کا حال مع انتخاب کلام درج کر دیا جائے گا۔

حصہ چہارم: طبقات شعرائے اردو۔ جس میں زبان اردو کے جملہ مشہور اور صاحب دیوان اساتذہ کی تقسیم ان کے زمانہ شاعری کے لحاظ سے حسب ذیل سات طبقوں میں کی جائے گی:

طبقہ اول: از ابتدا تا ۱۱۸۰ھ، طبقہ دوم: از ۱۱۸۱ھ تا ۱۲۱۰ھ، سوم: از ۱۲۱۱ھ تا ۱۲۴۰ھ۔ طبقہ چہارم: ۱۲۴۱ھ تا ۱۲۷۰ھ، طبقہ پنجم از ۱۲۷۱ھ تا ۱۳۰۰ھ، طبقہ ششم: از ۱۳۰۱ھ تا ۱۳۳۰ھ، طبقہ ہفتم از ۱۳۳۱ھ تا (رواں)

حصہ پنجم: مربیان شعرائے اردو، جس میں شاہان و امرائے دہلی و اودھ اور نوابان و امرائے مرشد آباد، عظیم آباد، حیدر آباد، دالپور، بھوپال، ٹونک، بنارس، کدورہ، فرخ آباد، باندہ وغیرہ میں سے ان کا حال درج کیا جائے گا جو خود شاعر تھے اور جنہوں نے اپنے زمانہ کے مشاہیر سخن کی مربی گری کی تھی''۔

سلاسل شعرائے اردو: اس حصے میں مندرجہ ذیل سلاسل شعرا کا نقشہ درج کیا جائے گا:

(۱) سلسلہ شاہ حاتم تا شاہ نصیر و شاگردان شاہ نصیر (بہ استثنائے ذوق و غالب)
(۲) سلسلہ ذوق و شاگردان ذوق (شاگردان داغ و ظہیر)
(۳) سلسلہ مومن و شاگردان مومن، مومن تا نسیم و تسلیم و شاگردان تسلیم
(۴) سلسلہ مظہر جان جاناں (۵) سلسلہ میر تقی میر
(۶) سلسلہ خواجہ میر درد (۷) سلسلہ حسرت و جرات، و شاگردان جرات
(۸) سلسلہ مصحفی و شاگردان مصحفی (۹) سلسلہ آتش
(۱۰) سلسلہ اسیر و امیر (۱۱) سلسلہ ناسخ
(۱۲) سلسلہ وزیر، اشک و برق (۱۳) سلسلہ غالب
(۱۴) اساتذہ و متفرق صاحبان دیوان شعرا

حواشی/تعلیقات

اس نوٹ کو خوش ستانی باور نہ کیا جائے۔ محض اطلاعاً عرض ہے کہ مولانا حسرت موہانی کی نثری تحریروں کے جو نمونہ گرد و غبار میں اٹے کتب خانوں کے عنوان سے قائم تہہ خانوں میں پڑے تھے وہاں سے ۲۵ سالہ جدوجہد کے بعد برآمد کر کے راقم کو انہیں مرتب کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ ان میں ایک ''تذکرۃ الشعرا از مولانا حسرت موہانی'' ہے جسے ادارہ یادگار غالب نے شائع کیا ہے۔ اس میں مجوزہ تذکرۃ الشعرا کے ضمن میں مولانا کے لکھے تمام مضامین حواشی و تعلیقات کے اضافہ کے ساتھ شامل ہیں۔

دوسرا مجموعہ ''مضامین حسرت'' ہے۔ اس میں مولانا کے ادبی مضامین ہیں یہ مکمل نہیں ہے جس قدر مضامین فراہم ہوئے شائع کر دیے گئے۔ کیونکہ میں زندگی کے اس مرحلے پر ہوں جہاں سے عالم البقا کو کوچ کر جانے کی خبر کبھی بھی عام ہو سکتی ہے۔ اس لیے کاوش سے جمع کیے ہوئے کاغذات کو زیور طبع سے آراستہ کر کے محققین کی خدمت میں انہیں اس لیے پیش کیا گیا ہے کہ اس کے غیر مکمل ہونے پر اعتراض نہ کریں۔ اپنی محنت سے اس کی تکمیل کریں۔

۲ علی گڑھ کالج میں حسرت ۱۸۱۹ء تا ۱۹۰۳ء تک رہے۔

۳ علی گڑھ میں ''انجمن اردوئے معلی'' کے قیام کا سہرا سجاد حیدر یلدرم کے سر تھا انہوں نے اپریل ۱۹۰۰ء میں اس کی بنا ڈالی۔ سجاد حیدر یلدرم تکمیل تعلیم کے بعد علی گڑھ سے چلے گئے تو انجمن ورثہ میں حسرت موہانی کو ملی۔

۴ حسرت موہانی: دیوان غالب مع شرح: طبع اول، علی گڑھ، ۱۹۰۵ء، صفحات ۲،۱

۵ ایضاً: ص ۲،۳

۶ ایضاً ص ۳

۷ گلدستہ حسرت کے بارے میں تفصیلی معلومات کے لیے ہمارا مضمون ''مولانا حسرت موہانی کے ابتدائی مجموعہ کلام'' ملاحظہ ہو جو کئی بار چھپا ہے۔ جیسے سہ ماہی اردو کراچی، اپریل تا جون ۸۸ء۔ رسالہ ماہ نو لاہور، اگست ۱۹۸۸ء اور ہماری کتاب ''مطالعہ حسرت موہانی'' میں بھی شامل ہے۔

۸ حسرت موہانی، دیباچہ گلدستہ حسرت، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۱۰ء

۹ مذکورہ پریس ایکٹ ۱۹۱۰ء سے نافذ العمل تھا۔ اس کے تحت اگر کوئی پریس قابل اعتراض مواد چھاپتا تو اس سے ضمانت طلب کی جا سکتی تھی۔ دوبارہ ایسا ہی جرم سرزد ہونے پر ضمانت ضبط کر لی جاتی تھی۔ یہ پریس پر پابندی کا فرعونی ہتھیار تھا۔ اسی پریس ایکٹ کے تحت ۱۳ مئی ۱۹۱۳ء کو حسرت موہانی کو نوٹس ملا کہ ان کے ''اردو پریس'' میں قابل اعتراض مواد چھپتا ہے اس لیے ایک ہفتہ کے اندر ۳ ہزار کی ضمانت جمع کروائی جائے ورنہ پریس ضبط کر لیا جائے گا۔ حسرت موہانی نے زر ضمانت جمع نہیں کروایا۔ ۱۹ مئی کو پریس ضبط ہو گیا جس کی مالیت بقول ابوالکلام آزاد پچاس روپیہ سے زائد نہ تھی۔ اسی پریس میں رسالہ اردوئے معلی چھپتا تھا اس کی اشاعت بھی مسدود ہو گئی۔

۱۰ انتخاب دیوان حسرت، مطبوعہ اردو پریس، علی گڑھ۔ سرورق کی پشت یعنی ص ۲

۱۱ حسرت موہانی، تحریر ۱۲ فروری ۱۹۱۳ء

۱۲ حسرت موہانی، دیباچہ تذکرۃ الشعرا، علی گڑھ، جولائی ۱۹۱۴ء

۱۳ حسرت موہانی، نکات سخن، طبع اول۔ کانپور ۱۹۳۰ء، ص ۲،۳

۱۴ حسرت موہانی، ارباب سخن (طبع اول): مطبع انیس الطابع، کانپور ۱۹۲۹ء، ص ۱

ہم نے حسرت موہانی کے لکھے ہوئے ۱۱۸ شاعروں پر مضامین کو ان سلاسل شعرا کے لحاظ سے مرتب کیا ہے جسے ادارہ یادگار غالب نے ۱۹۹۹ء میں ''تذکرۃ الشعرا از حسرت موہانی'' کے نام سے شائع کیا ہے۔

حفیظ ہوشیار پوری اور ان کے چند احباب

ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ

انسان اپنے خاندان کا انتخاب خود نہیں کر سکتا لیکن حلقہ احباب کے انتخاب میں با اختیار ہوتا ہے۔ کیا دوستوں کی موجودگی انسان کی شخصیت کی تعمیر و تکمیل کے لیے ضروری ہے؟ اس کا جواب ارسطو اثبات میں دیتا ہے۔ ارسطو کے نزدیک انسان معاشرے کی پیداوار ہے۔ وہ شخص جو تن تنہا زندگی گزارتا ہے، یا تو حیوان ہے یا پھر جنگلی۔ اس لیے وہ فطری طور پر گروہ پسند ہے اور دوسروں کے ساتھ وابستگی پسند کرتا ہے اور مل کر زندگی گزارنا پسند کرتا ہے۔

انسان دوسروں کے ساتھ وابستگی پسند کرتا ہے لیکن کیا ہر ایک کے ساتھ؟ اس کا جواب اثبات میں نہیں ہے کیونکہ ہر فرد فطرتاً دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ یہ اختلاف اندھیرے اور اجالے کی مانند واضح بھی ہو سکتا ہے اور نہایت معمولی بھی۔ یوں بھی ہوا ہے کہ ایک فرد کی طبیعت دوسرے سے حد درجہ مماثلت رکھنے کے باعث اسی کی شخصیت کا پرتو معلوم ہونے لگتی ہے اور کبھی طبیعتوں میں زمین و آسمان کا بعد ہوتا ہے۔ دراصل فرد کی طبیعت، رجحان اور رویے کسی دوسرے کو اس سے حد درجہ قریب یا بے حد دور کر دیتے ہیں۔ ایک شخص مجلسی زندگی کا شائق ہے اس کے گرد احباب کا ہجوم ہے، یہ الگ بات ہے کہ وہ خود کبھی کبھی یہ محسوس کرنے لگے کہ ان میں حبیب تو ایک بھی نہیں۔ دوسرا فرد دوستوں کے انتخاب میں بہت محتاط ہے۔ چند گنے چنے دوست جو زندگی کے ہر دکھ سکھ میں شریک ہیں جیسا کہ حفیظ، ان کے تمام دوستوں میں ذہنی ہم آہنگی تھی۔

پیر حسام الدین راشدی

حفیظ ہوشیار پوری کی شخصیت کو مدنظر رکھا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ وہ مجلسی آدمی قطعی نہ تھے بلکہ نہایت خاموش طبع، لیے دیے رہنے والے شخص کی حیثیت سے مشہور تھے۔ لیکن اس میں سو فیصد صداقت کی تلاش بے معنی ہے کہ حفیظ کے دوستوں کی تعداد زیادہ نہیں تو بہت کم بھی نہیں ہے۔ البتہ ان کے حلقہ احباب میں ہر قسم کے لوگ شامل نہ تھے بلکہ وہی ان کے دل کے قریب تھے جو ان کے مزاج آشنا تھے اور ان جیسا مزاج بھی رکھتے تھے۔ یعنی اہل علم و فن، شاعر، ادیب و محقق۔

''پاکستان بنے ابھی ایک آدھ سال ہی گزرا ہوگا کہ کئی ایک نامی شاعر، مشاہیر اہل قلم اور نامور ادیب ہندوستان تیاگ کر یہاں پہنچ گئے۔ مولانا عبدالحق اپنے رفقا کیفی صاحب اور سید ہاشمی کے ساتھ پہنچ گئے تھے۔ قاضی محمد میاں اختر جونا گڑھی تشریف لے آئے اور ان کا تعلق بھی انجمن سے ہو گیا تھا۔ صبح و شام کی اکثر و بیشتر مجلسیں مولوی صاحب کے ہاں ہوا کرتی تھیں۔ لیکن رات کی محفل گئی رات تک قاضی صاحب مرحوم کے ہاں لازمی ہو گئی تھی۔ بلا ناغہ روز آنے والوں میں چار ایسے دوست تھے

جنہیں اس زمانے میں ''اخوان الصفا'' کہا جاتا تھا۔ ایک یہ نیاز مند، قاضی صاحب، حفیظ ہوشیار پوری اور ممتاز حسن اس اخوان الصفا کے چار رکن تھے''۔(۱)

پیر حسام الدین راشدی سے حفیظ کی دوستی ذہنی ہم آہنگی کی بنا پر قائم ہوئی۔ حفیظ شاعر کا دل لیکن محقق کا دماغ رکھتے تھے۔ پیر حسام الدین راشدی تحقیق کے آدمی تھے۔ پرانی کتابوں کی تلاش وجستجو دونوں کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس شوق میں قاضی احمد میاں اختر اور ممتاز حسن بھی شامل تھے۔

''پیر حسام الدین راشدی، ڈاکٹر ممتاز حسن، حفیظ ہوشیار پوری اور یہ ناچیز دوسرے تیسرے دن وقت نکال کر قاضی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان سے استفادہ کرتے۔ میری حیثیت تو اک طفل مکتب کی تھی لیکن پیر صاحب اور ممتاز حسن صاحب اور حفیظ ہوشیار پوری خود بھی بڑے عالم تھے۔ علوم شرقیہ اور غربیہ کے تینوں کولمبس جب اپنی اپنی علمی وادبی دنیاؤں کی دریافت کا احوال بیان کرتے تو میں متحیر ہو جاتا اور سوچتا کہ ہزار برس میں اتنی سیاحت علم وادب کی دنیا کی نہیں ہو سکتی، جتنی ان بزرگوں نے تھوڑی سی زندگی میں کر لی''۔(۲)

ادبی دنیا کے ان کولمبس حضرات کا احوال ان کے تحقیقی کارناموں ہی کی صورت میں نظر نہیں آتا بلکہ ان کے نجی خطوط بھی کسی تحقیقی مقالے سے کم مرتبہ نہیں رکھتے۔ نقوش میں شائع شدہ چار خطوط بنام پیر حسام الدین راشدی، حفیظ کے ذوق تحقیق کا بین ثبوت ہیں۔ یہ خط حفیظ نے قیام لندن کے دوران لکھے۔ جبکہ وہ وہاں مثنویات ہیر رانجھا کی تلاش میں اور بہت سے تحقیقی موضوعات کو سمیٹنے جا رہے تھے۔ یہ خطوط ۵۷ء میں لکھے گئے۔ حسام الدین راشدی کو ان کی اشاعت کا خیال ۱۹۶۶ء میں اس وقت آیا کہ جب محمد طفیل مدیر نقوش نے ان سے حفیظ کی غزلوں کی فرمائش کی تھی کہ خود حفیظ تو اپنے کلام کی نشر واشاعت کے سلسلے میں حد درجہ بے نیاز تھے۔ محمد طفیل کے نام راشدی، حفیظ کے خطوط اپنے مکتوب کے ہمراہ ارسال کرتے ہیں۔ جس میں حفیظ کی صحت پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ ''حفیظ ایک بجھے ہوئے چراغ کی مانند ہے جس کی لو سے فقط دھواں نکل رہا ہو''۔

حفیظ کے یہ خطوط تحقیق سے ان کی دلچسپی کو ظاہر کرتے ہیں اور قاری کو ان گوشوں سے متعارف کرواتے ہیں کہ جن سے اب تک وہ ناواقف تھا۔ لیکن حفیظ کے دوستوں کے لیے راشدی صاحب کا خط ذہنی صدمے کا باعث بنا کہ جس میں حفیظ کو بجھے ہوئے چراغ سے تشبیہہ دی گئی ہے۔

سید محمد نواز

حفیظ کی زندگی میں بھی سید نواز حفیظ سے بے حد قریب تھے۔ مذکورہ بالا خط ان کے لیے پریشانی کا باعث بنا۔ کراچی پہنچے۔ حفیظ سے ملاقات ہوئی تو انہیں صحت مند محسوس کیا۔ کراچی میں بھی راشدی صاحب کے اس خط کو پڑھ کر بھی احباب متعجب تھے۔ اور حفیظ نے ۔۔۔۔ ''کیا جانیے اس نے مجھے کس حال میں دیکھا''۔۔۔۔ کہہ کر نظر انداز کیا۔ سید محمد نواز، محمد طفیل، مدیر نقوش کے نام اپنے خط میں صورت حال پر حفیظ کا جواب پیش کرتے ہیں۔

''پیر صاحب نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ حفیظ ایک بجھے ہوئے چراغ کی مانند ہے جس کی لو سے فقط دھواں نکل رہا

ہو''۔ اس کے جواب میں حفیظ نے صائب کا یہ شعر پڑھا:

ندارد دود مان عشق چوں من افروزے یہ مستی کند پروانہ از دود چراغ من

اس پر آٹھ سال پہلے کا ایک منظر میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ یہ ۵ ستمبر ۱۹۵۸ء کا واقعہ ہے۔ جناح ہسپتال کے سپیشل وارڈ کے ایک کمرے میں حفیظ نیم بے ہوشی کے عالم میں تھے۔ اپنے ماحول سے بے خبر۔ خدا جانے کس کیفیت میں انہوں نے ایک قطعہ اور غزل کے کچھ شعر کاغذ کے ایک پرزے پر لکھے۔ وہ پرزہ بستر سے فرش پر گرا اور ایک دوست کے ہاتھ لگا۔ اور اس طرح یہ شعر اتفاقاً محفوظ ہو گئے۔ بعد میں جب انہیں یہ شعر سنائے گئے تو شعوری طور پر انہیں خود یہ علم نہیں تھا کہ یہ شعر انہوں نے لکھے ہیں۔ ان میں ایک خاص کیفیت جھلک رہی ہے اور چونکہ ابھی تک کہیں نہیں چھپے۔ آپ یقیناً سننا چاہیں گے۔ قطعہ یہ ہے:

تم کہاں ہو گے ہم کہاں ہوں گے فاصلے کتنے درمیاں ہوں گے
جو نہ تھے بار خاطر احباب دوش احباب پر گراں ہوں گے

غزل

ہمیں جہاں ہیں راز آشنا قیامت کے کہ فاصلے ہیں قیامت ، رہ محبت کے
اس ایک بات کا غم ہے کہ رائیگاں کھوئے شب فراق میں اوقات اپنی فرصت کے
وہ آنے والے ہیں شاید کہ میرے ذہن میں آج ابھر رہے ہیں خدوخال ان کی صورت کے
نہ کوئی رسم وفا، سوا محبت کے نہ کوئی شرط، سوا شرط آدمیت کے

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ عالم بیماری میں بھی حفیظ کو نوائے سروش میسر رہی چہ جائیکہ صحت یاب ہونے کے بعد وہ اس قدر بجھ جاتے جیسا کہ پیر حسام الدین راشدی کے خط سے ظاہر ہوتا تھا''۔(۳)

جس سے محبت ہو اسے کن کن نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ راشدی اور نواز دونوں کے خطوط حفیظ کی محبت کے امین ہیں راشدی انہیں تر وتازہ صحت مند اور ہنستا مسکراتا دیکھنا چاہتے تھے اور نواز کے نزدیک وہ صحت مند تھے۔ ان کی پژمردگی یا تھکن کا وہ تصور بھی کرنا نہ چاہتے تھے۔

حفیظ ونواز کے دلی تعلق کی مدت دو ایک روز نہیں، سالوں پر محیط ہے۔ اصل دوست وہی ہے جو تنگ دستی میں ساتھ دے اور جن کے درمیان تکلف نام کی کوئی چیز نہ ہو۔ حفیظ ونواز کا ساتھ ایسا ہی تھا۔

''سادگی طبیعت میں ایسی تھی کہ تکلف کا نام ہی نہ تھا۔ ۱۹۵۰ء میں ان کے عزیز دوست نواز نے کراچی میں چار کمرے کرائے پر لیے اور حفیظ کو اپنے ساتھ ٹھہرایا، پھر دو کمرے مکان دار نے خالی کرا لیے جگہ تنگ ہو گئی کہ نواز کے اہل وعیال بھی ساتھ تھے۔ حفیظ نے کہیں اور جانے کی ٹھانی، نواز نے کہا کیا اس تنگی میں ساتھ نہ دو گے؟ بس اب حفیظ کہاں جا سکتے تھے۔ تنگی میں ساتھ دیتے رہے اور تکلیف بھی خاصی اٹھائی۔ لاہور کی محبتوں کا حال نواز، شیخ اعجاز احمد اور کلیم عثمانی خوب سنا سکتے ہیں۔ بقول کلیم بزم سونی ہے خوش مقالوں کی۔ اس ماتمی قطعے کے آخر میں انہوں نے یہ بھی لکھا ہے:

کب ملے اس سے کب اسے چاہا　　کیا ضرورت ہے ان سوالوں کی
ہم ازل سے تھے آشنائے حفیظ　　گو رفاقت تھی چند سالوں کی

کراچی میں بھی نواز اور شیخ صاحب موصوف کے علاوہ اہل ذوق اور اہل خلوص میں ہی ابن الحسن برنی، مشتاق احمد یوسفی منظور الٰہی، مقبول وارثی، اشرف ریاض اور شاعروں میں محشر بدایونی، تابش دہلوی، نظر امروہوی، حمید نسیم، ضیا جالندھری، صہبا اختر، شاعر لکھنوی مرحوم کے ساتھ ان کی صحبتیں گرم ہیں اور یوں تو کون تھا جس نے حفیظ کو تھوڑا بہت دور یا نزدیک سے نہ جانا ہو اور جانا ہو تو مانا یا چاہا نہ ہو"۔ (۴)

پھر نواز جیسا مزاج آشنا اور ذہنی ہم آہنگی رکھنے والا دوست جو زندگی کے تمام دکھوں اور سکھوں میں شریک رہا ہو۔ جو جذبۂ رقابت سے عاری اور جوش رفاقت سے بھرپور ہو۔

یہ وہ دوست ہیں کہ جن میں نہیں جذبۂ رقابت　　یہ نواز ہے تمہارا یہ حفیظ ہے تمہارا

حفیظ کی دوستی معیار و مقدار کے اصول پر کاربند رہی کہ دوستوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں لیکن جو دوست ہیں وہ ایسے کہ زندگی بھر جن سے رشتہ رفاقت برقرار رہا۔ غلط فہمیوں کی دھول اور دھند نے اس آئینہ کو کبھی دھندلایا نہیں۔ حفیظ کو اس معاملے میں اپنی خوش نصیبی پر ناز تھا کہ حرص و ہوس کی اس دنیا میں جہاں خلوص و بے غرض محبت کا تصور بھی ممکن نہیں، خدا کی عنایت ہے کہ انہیں اچھے دوستوں کی محبت میسر رہی۔

کچھ دوست مل گئے ہیں یہاں اتفاق سے　　ملتے ہیں ورنہ دوست کہاں اتفاق سے

دوستی کچھ لینے اور کچھ دینے کا نام ہے، ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے اس لینے اور دینے میں مادی اشیا اور مال دولت کو اہمیت دی ہے جب کہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم کسی سے محبت و خلوص سے پیش آئیں گے تو جواب میں وہ ہمیں اپنی بے غرض محبت سے نوازے گا۔ ہم یہ اصول بھول کر شکوہ و شکایت میں مصروف ہو گئے ہیں۔

"۔۔۔۔ اور دوستوں کا تو پوچھنا ہی کیا یہ ان پر فدا تھے اور وہ ان پر۔ ان کے قریبی دوستوں پر نظر ڈالیے تو ان میں بھی ایک نہ ایک ایسی ادائے محبوبی نظر آتی ہے کہ زندگی میں بہت عام نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں کہ آدمی اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے ان کا کردار اس کسوٹی پر بھی کھرا اترتا ہے"۔ (۵)

حفیظ کے تمام دوست اس بارے میں رنجیدہ خاطر رہا کرتے تھے کہ حفیظ کی فطری بے نیازی اور پرفیکشن کی عادت انہیں کلام کو مکمل صورت میں شائع کروانے میں ہمیشہ مانع رہی۔ جب بھی ان کے مجموعہ کلام کی اشاعت کی بات ہوتی وہ مصروفیت کا عذر کر دیتے۔ زیادہ اصرار کیا جاتا تو مجموعے کو از سر نو دیکھنے اور پرکھنے کی خواہش کا اظہار کرتے اور یوں وقت گزرتا جاتا۔

"۔۔۔۔ مشتاق یوسفی صاحب نے کہا ہم ان کا کلام چپکے سے چھپوا کر ایک سرپرائز کے طور پر انہیں پیش کر دیں ویسے تو یہ ٹالتے ہی رہیں گے۔ مجموعہ نواز نے لے لیا تھا۔ مگر چھپوانے سے پہلے اسے ان کی نظر سے ایک بار گزار لینا ضروری تھا۔ اس لیے انہیں دکھانا پڑا۔ مگر وہ تو اسے لے کر ہی بیٹھ گئے۔ کچھ ترمیم و تنسیخ تو کی لیکن چھپنے کے لیے حوالے نہ کیا۔ آخر تک جب وہ ہسپتال میں داخل، دل اور سانس کے مریض، چل چلاؤ کے عالم میں تھے، مسودہ ان کے پاس رہا جس پر وہ نظر ڈالتے رہے اور کچھ اضافہ

بھی کیا۔ مگر چھپنے کے لیے اصرار کے باوجود نہ دیا۔ افسوس کہ یہ ان کی زندگی میں نہ چھپ سکا۔ انتقال کے بعد مجھ سے فرمائش ہوئی۔ اسے جلد از جلد چھپوا دیں۔ اردو اکیڈمی سندھ سے اس کی طباعت کا معاہدہ کیا گیا۔ ٹائٹل میں نے صادقین سے بنوایا اور انہوں نے خوشی سے بنا دیا کہ حفیظ کو وہ بھی مانتے اور جانتے تھے۔ میں نے نواز سے کہا کہ مقدمہ یا تعارف لکھ دیں کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ ان کے قریب رہے تھے۔ مگر وہ قلم کے بھی چور تھے اور شرمیلے اور منکسر المزاج بھی اس قدر کہ اپنی عمدہ لیاقت کے باوجود ہراساں ترساں اور سامنے آنے سے گریزاں۔ کم ہی لوگوں کو علم ہوگا کہ خلوص و محبت کا پتلا نواز جو اب خود بھی اللہ کو پیارا ہوا، اپنی ذات سے بھی کتنا اچھا شاعر تھا۔ ہم اس کے منہ سے تو اس کا کلام سنتے رہے مگر بیاض اب اس کے انتقال کے بعد نکلی ہے۔ اس نے جیتے جی اس کی ہوا بھی نہ دی۔ اگرچہ میں برابر اس پر اصرار کرتا رہا۔ اوروں نے بھی شاید ترغیب دی ہوگی۔ اب اس کے صاحبزادے بیاض یہاں پہنچا گئے ہیں۔ سلطان محمد اسے چھپوا رہے ہیں۔ حفیظ کے مجموعے کے جملہ مراحل بھی میں نے طے کرائے ۔۔۔۔ "مقام غزل" پر رائے قرار پائی ۔۔۔۔ نواز نے اس مجموعے کا ایک اور ایڈیشن لاہور میں چھپوایا۔ یہ میں نے نہیں دیکھا۔ مگر معلوم ہوا کہ حفیظ کی صاحبزادی نے اس بات کو پسند نہیں کیا۔ شاید اس لیے کہ ان کی اجازت کے بغیر چھپا ہوگا اور اسے تقسیم کرنے کی سختی سے ممانعت کر دی ہے۔ نواز اس بات پر بہت آزردہ تھے۔ جو کچھ کیا گیا حفیظ کی محبت کی خاطر کیا گیا۔ میں نے تعارف بھی دل پر ہاتھ رکھ کر لکھا تھا۔ موضوع کا حق ادا کرنے کی مقدور بھر کوشش کی تھی کہ اس سے میرا ذاتی لگاؤ بھی تھا اور ایک طرح کی ذمہ داری بھی ۔۔۔۔"(۶)

نواز کے دل میں حفیظ اور ان کی شاعری سے محبت رچی بسی تھی۔ حفیظ کی زندگی میں بھی اور بعد میں بھی ان کی شدید خواہش تھی کہ حفیظ کا تمام کلام یکجا ہو کر اہل ذوق کے سامنے آئے۔ حفیظ سے دیرینہ نیازمندی کی بنا پر خط و کتابت بھی رہی۔ یہ خطوط بھی ایک بیش بہا خزینہ ہیں۔

"۔۔۔۔۔۔۔۔ اگست ۱۹۶۴ء میں لاہور سے میں نے حفیظ کو ایک خط میں غزل کے کچھ شعر بھیجے۔ مطلع یہ تھا:

نہ کسی سے پیار مجھ کو، نہ ہوں میں کسی کو پیارا　　میں وہ موج مضطرب ہوں نہ ملا جسے کنارا

حفیظ کا جواب اسی زمین میں ایک نہایت شگفتہ غزل کی صورت میں آیا۔ ان کا خط ملنے پر میں نے انہیں لکھا کہ "حفیظ اگر میری ہر سعی ناکام کے جواب میں تم ایک نئی غزل کہنے کا وعدہ کرو تو میں ہر روز کچھ الٹے پلٹے شعر تمہیں لکھ بھیجا کروں۔ اور تمہاری ایک تازہ بہ تازہ غزل آ جایا کرے۔ یہ مجھ پر بھی احسان ہوگا، آنے والی نسلوں پر بھی۔ اردو ادب پر بھی۔ یہ غزل بھی غیر مطبوعہ ہے اور درج ذیل ہے:

کبھی اس طرف اشارا کبھی اس طرف اشارا　　سر بزم منتخب کر کسی ایک کو خدارا
غم عشق اگر نہ ہوتا تو نہ ہم کہیں کے رہتے　　یہی موت کا بہانہ یہی زیست کا سہارا
یہ وہ دوست ہیں کہ جن میں نہیں جذبہ رقابت　　یہ نواز ہے تمہارا یہ حفیظ ہے تمہارا

حفیظ ۳ جنوری سے ایک سال کی رخصت پر ہیں۔ رخصت ختم ہوتے پر ملازمت سے ریٹائر ہو جائیں گے۔ وہ اس بات پر بہت خوش ہیں۔ اپنے کاغذات ٹھیک ٹھاک کر رہے ہیں۔ اب امید بندھی ہے کہ اپنے کلام کی ترتیب کا کام بھی شروع کر دیں

نذر ہو چکا ہے۔ لہٰذا یہ دیکھ کر مطلق تعجب نہیں ہوا کہ مشاعرے کے سامعین کی ایک بڑی تعداد کے لیے حفیظ صاحب بالکل اجنبی تھے۔ صرف حفیظ صاحب پر ہی کیا منحصر ہے مشاعروں اور علمی تقریبات میں شریک ہونے والے سامعین کی اکثریت اس سرکاری افسر یا سیاسی شخصیت ہی کو جانتی ہے جو مسند صدارت پر جلوہ افروز ہوتی ہے۔ یہ ایک عظیم تہذیبی المیہ ہے''۔ (۱۲)

اس مضمون کی اشاعت کے ایک ماہ اور چھ روز بعد حفیظ صاحب اس دنیا سے رخصت ہوئے لیکن چاہنے والے دلوں میں ان کی یاد زندہ رہی۔ قاضی محمد اختر نے اپنے والد کے اس دیرینہ رفیق کو برسی کے موقع پر بھی یاد رکھا۔ روزنامہ جنگ میں مطبوعہ مضمون میں حفیظ کی وفات کے بعد ان کے شعری مجموعے مقام غزل کی اشاعت پر مسرت کا اظہار کیا کہ وہ جانتے تھے کہ حفیظ جیسا بڑا شاعر زندگی میں اپنی بے نیازانہ طبیعت کے باعث لوگوں کے ذہنوں سے محو ہوتا جا رہا تھا۔ کلام کو یکجا ہو کر شائع ہونا اسے ادب میں پائندگی عطا کرے گا۔

''اردو زبان اور شعر و ادب سے حقیقی شغف رکھنے والے حضرات کے لیے یہ امر یقیناً مسرت کا باعث ہوگا کہ اردو کے ایک جدید غزل گو شاعر کا مکمل کلام ''مقام غزل'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے''۔ (۱۳)

وفا راشدی حفیظ صاحب کے دیرینہ رفیق جب مشرقی پاکستان سے لاہور تشریف لائے تو مولانا صلاح الدین احمد، ایڈیٹر ادبی دنیا کے توسط سے حفیظ ہوشیار پوری سے ملاقات ہوئی اور یہ ملاقات مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر محبت و دوستی کے جذبے سے بھرپور ماحول میں ہوتی رہی۔ ایسے ہی ایک موقع کا تذکرہ وفا اپنے مضمون میں کرتے ہیں۔

''ڈاکٹر یوسف حسین کراچی تشریف لائے تو ان کے اعزاز میں خواجہ حمید الدین شاہد، مدیر سہ ماہی اردو نامہ کی قیام گاہ پر ایوان اردو کے زیر اہتمام ایک ادبی نشست کا انعقاد ہوا۔ اس اجلاس میں کراچی کے نامور دانشوروں اور شعرا، ادبا کے علاوہ حفیظ ہوشیار پوری بھی تشریف فرما تھے۔ مشاعرے کا دور شروع ہونے سے پہلے اتفاق سے حفیظ کے برابر مسند ملی مجھے مخاطب کر کے فرمانے لگے۔ ''وفا صاحب کراچی آنے کے بعد تو آپ بے وفا ہو گئے ہیں'' ان کی آنکھوں میں جو شفقت و محبت اور ان کے سوالیہ الفاظ میں جو خلوص و کشش تھی، اس کی تاب میں نہ لا سکا اور میری آنکھیں ندامت سے جھک گئیں''۔ (۱۴)

شیخ صلاح الدین

شیخ صلاح الدین احمد، حفیظ صاحب کے قریبی دوستوں میں سے ایک، کہ ناصر کاظمی بھی اپنے مضمون میں ان کا تذکرہ کرتے ہیں'' .... بیدل اور غالب کا قائل ہے۔ ویسے میر کا نام اس نے اپنے ایک مقطع میں استعمال بھی کیا ہے۔

نقش ہے قولِ میرؔ دل پہ حفیظؔ کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے''

مگر شیخ صلاح الدین نے اسے قائل کر لیا کہ اس پر میر کا بھی اثر ہے۔ شیخ صلاح الدین کا ذکر میں نے یہاں اس لیے کیا کہ یہ ایک شخص ہے کہ جس کی بات حفیظ بھی نہیں موڑتا خواہ وہ کچی ہو یا اس میں کوئی کھپلا ہو۔ (۱۵)

شیخ صاحب کے نام حفیظ کے خطوط اس امر کے گواہ ہیں کہ زمانی فاصلوں نے دلوں میں عدیم الفرصتی کے باوجود دوری پیدا نہیں کی۔ اس وقت میرے پیش نظر حفیظ کا ۲۲ صفحات پر شیخ صلاح الدین کے نام تحریر کردہ خط ہے۔ خط کیا ہے، ایک ایسا مجموعہ انتخاب

ہے کہ جس میں طنز و مزاح، تاریخ گوئی، قصہ گوئی، غزل، تحقیق و تنقید، علم و ادب اور تاریخ کے بوسیدہ اوراق میں مدفون داستانوں کا بیان یکجا نظر آتا ہے۔ حفیظ جیسے مصروف انسان کے لیے اسے ایک نشست میں مکمل کرنا ممکن نہ تھا۔ ۱۲ اگست تا ۲۶ اگست ۱۹۵۳ء تک لکھے گئے اس خط کا آغاز، کیا غالب کے خطوط کی یاد تازہ نہیں کرتا۔ وہی سادگی اور وہی بے تکلفانہ انداز۔

''صلاح الدین۔ جب کوئی ''بیرنگ'' خط آتا ہے تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ کسی ایڈیٹر نے مضمون یا غزل کی فرمائش کی ہے۔ رجسٹرڈ خط عام طور پر کسی اجنبی کی طرف سے ''قطعہ تاریخ'' کی درخواست ہوتی ہے۔ ''رسید طلب'' رجسٹرڈ خط اس بات کا ہوتا ہے کہ کسی ''کتاب فروش'' نے بل ادا کرنے کا تقاضا کیا ہے۔ ۱۲ کی صبح کو ڈاکیے نے پہلے ایک رسید پر دستخط کرائے۔ جس کا یہ مطلب تھا کہ خط لکھنے والے کو ڈاکخانے کے انتظامات پر اعتماد نہیں۔ جب اس نے دوسری رسید پیش کی تو میں نے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھا۔ گویا، مکتوب الیہ بھی ناقابل اعتبار ہے۔ آخر میں اس نے لفافہ میرے ہاتھ میں دیا۔ کونے میں تمہارا نام پڑھ کر ''ندامت آمیز'' اطمینان ہوا۔ اطمینان، اس لیے کہ ''پہل'' کا سہرا تمہارے سر رہا۔ اور ندامت اپنی طویل خاموشی پر۔

تمہارا خط لکھنے کا مشغلہ میرے لیے باعث رشک ہے۔ خدا کرے کہ یہ سلسلہ جاری رہے۔ یہاں تک کہ وہ امریکائی خاتون جسے بڑھاپے میں اسلام کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا ہے، بالکل مطمئن ہو جائے۔ میرا خیال ہے کہ اگر پاکستان میں ایسے ..... تمہاری طرح بہت سے لوگ پیدا ہو جائیں تو آئے دن دوسرے ملکوں میں ثقافتی مشن بھیجنے کی ضرورت نہ رہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس جرمن دوشیزہ اور اطالوی نوجوان کے پتے بھی تمہیں بھیج دوں۔ جن سے تہران میں خط لکھنے کا وعدہ کر کے آیا تھا''۔ (۱۶)

اس کے بعد حفیظ اپنے پسندیدہ موضوع یعنی قدیم کتب سے منتخب حصے جو زمانے کی نظروں سے اوجھل ہوتے جا رہے ہیں، لیکن یاد رکھنے کے قابل ہیں، شیخ صاحب کو سناتے ہیں۔ پھر خیال آتا ہے کہ خط غالباً خشک ہوتا جا رہا ہے (حالانکہ ایسا نہیں ہے) اس موضوع سے گریز اختیار کرتے ہیں۔

''اس سے پہلے کہ تم اکتا جاؤ میں اور موضوعات کی طرف توجہ کرتا ہوں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ اگر ہماری ملاقات ہوتی اور تم مجھ سے اس کتاب کا ذکر کرتے تو میں یہ سارا قصہ اس صورت میں بھی سناتا۔ فرق صرف یہ ہوتا کہ زبانی گفتگو کے دوران چار زبانوں میں بات کرنا پڑتی۔ اردو، پنجابی، انگریزی، فارسی۔ بہر حال یہ ساری باتیں میں نے کہہ ڈالیں، اس لیے کہ میں نہ صرف محسوس کر رہا ہوں کہ تم میرے پاس بیٹھے ہو بلکہ دیکھ رہا ہوں کہ تم میرے پاس بیٹھے ہو۔ نہ صرف تم بلکہ اور دوست بھی۔ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ انتظار حسین چپ چاپ ہمارے پاس بیٹھا ہے۔ ہاں جب تم نور عالم کا نام لیتے ہو تو اس کی بے نور آنکھوں میں عارضی طور پر چمک آ جاتی ہے۔ انور جلال Abstract Art پر لیکچر دے رہا ہے اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ ہم سب اس کی باتیں سمجھ رہے ہیں۔ ناصر کوئی ایک گھنٹہ ہوا یہ کہہ کر اٹھا تھا کہ ابھی دو منٹ میں واپس آتا ہوں اتنے میں سامنے سے ایک گول مٹول سی پیاری سی چیز ہماری طرف بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے جیسے کوئی سر کے بل چل کر آ رہا ہو اور دو منٹ میں سلیم شاہد میرے پاس آ کر بیٹھ جاتا ہے۔ ''شی ساب اج پتہ ای نہیں لگا کس ویلے آ گئے سی۔ اک کاغذ تھوڑے کمرے چے .... ''تمہارے کانوں میں حسب معمول یہ سرگوشی پہنچ جاتی ہے اور تمہاری بروقت دخل اندازی سے'' یہ دکاندارانہ گفتگو'' شروع ہونے سے پہلے بند ہو جاتی

ہے اور تھوڑی دیر بعد میں یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوتا ہوں کہ ۸ بجنے کو ہیں۔ مجھے دفتر جانا ہے۔ تمہارا اشارہ پا کر اٹھ کھڑا ہوتا ہوں اور سیدھا گھر کا رخ کرتا ہوں''۔(۱۷)

خط کے اس اقتباس سے عیاں ہے کہ حفیظ اپنے دوستوں سے کس قدر محبت کرتے تھے، ان کی ضرورت اور اہمیت سے آگاہ تھے ان کی کمی محسوس کرتے تھے اور یہ کمی تصور کی مدد سے پوری کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔

پھر کہاں مجمع احباب حفیظ چار دن جینے کی فرصت مت پوچھ

اسی مذکورہ خط میں حفیظ دیگر فلسفیانہ مسائل کے علاوہ فلسفہ دوستی اور عقل و وجدان کو بھی موضوع بحث بناتے ہیں۔

''.....میرے دوست، دوستی خود دوستی کا انعام ہے۔ اس کے لیے اظہار کی ضرورت نہیں اور وہ بھی کسی کی آڑ لے کر۔ زیر بحث کتاب بھیجنے سے مقصود ''اظہار دوستی'' نہ تھا اور نہ اس کے لیے میں نے کسی کی آڑ لی۔ البتہ اب مجھے محسوس ہوا یہ کتاب ڈاک کے ذریعے بھیجنی چاہیے تھی۔ یہ احساس پیدا کرنے کا شکریہ..... زندگی میں کتنے ''موقعے'' اور ''انسان'' ایسے ہوتے ہیں جو عقل اور وجدان، دونوں کو آسودہ کر سکتے ہیں۔ ہم کیوں فقط ایک موقع یا انسان سے مطمئن نہیں ہوتے۔ تنوع کی تلاش میں کیوں رہتے ہیں۔ دن میں کئی بار اپنے مشاغل کیوں تبدیل کرنے پڑتے ہیں؟ اکثر لوگ اپنے حلقۂ احباب کو ایک یا دو تک محدود کیوں نہیں کر سکتے؟ ہم مختلف عمروں، جنسوں، طبیعتوں اور مشغلوں کے لوگوں سے ملنا کیوں پسند کرتے ہیں۔ ایک دوست کی موجودگی دوسرے دوست کی کمی کو کیوں پورا نہیں کر سکتی۔ ان سب سوالوں کی تہہ میں اور باتیں بھی ہو سکتی ہیں لیکن بنیادی وجہ یہی ہے کہ ہر وقت اور ہر موقع پر انسان اپنی پوری شخصیت کو آسودہ نہیں کر سکتا۔ اس حقیقت کو فراموش کر دینے کے نتائج کبھی کبھی بہت دور رس ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی میں ایک خوبی ہے تو وہ شخص خود یا اس کے دوست دنیا بھر کی دوسری خوبیاں بھی اس کی ذات سے منسوب کر دیتے ہیں۔ یا اگر اس میں کوئی ایک خامی ہے تو زمانے بھر کی خامیاں اس میں ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ انسانی شخصیت کی سالمیت اور اس کے تحفظ کے لیے ضروری ہے کہ اگر بیک وقت اس کے دونوں رخوں یعنی عقل و وجدان کی تسکین ممکن نہ ہو (جیسا کہ آج کل ہوتا ہے) تو مختلف اوقات اور مختلف حالات میں الگ الگ ان کی نشو و نما میں کوشاں ہو اور اگر ایک شخص کسی پہلو کی تسکین نہیں کر سکتا، تو اس کی شکایت نہ کریں۔ اس کو نظر انداز کرنے سے ایسی مہلک کمزوریاں پیدا ہوتی ہیں جو شخصیت کو تباہ کر دیتی ہیں۔ مثلاً خود غرضی، حسد، بغض، بدگوئی اور خود نمائی۔ اگر کوئی دوست ہماری اپنی ذہنی سطح کا ساتھ نہیں دے سکتا تو محض اسی بنا پر اسے ترک نہیں کر دینا چاہیے۔ اس کی دوسری خوبیوں کو دیکھنا چاہیے۔ اگر صرف اس بات پر ہم اسے ترک کر دیں گے تو یہ خود غرضی اور تنگ نظری ہوگی اور اگر وہ دوست اس بنا پر ہم سے الگ ہو جائے گا کہ شخصیت کے باقی پہلو کی تسکین کے لیے ہمیں اور دوستوں کا مرہون منت ہونا پڑتا ہے کہ اس میں حسد اور بغض کے جذبات پیدا ہوں گے اور یہ باتیں انسانی تعلقات کے لیے کتنی مہلک ہیں۔ اس لیے میری انتہائی کوشش یہی ہوتی ہے کہ زیادہ تر صرف ان لوگوں سے ملوں جو پوری شخصیت کو متاثر کر سکیں۔ اسی لیے میرے صحیح دوستوں کی تعداد نہایت محدود ہے۔ بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے اور مجھے اسی بات پر فخر ہے کہ یہ دوست بیک وقت میرے لیے ''ذہنی آسودگی'' اور قلبی انشرح کا باعث ہوتے ہیں''۔(۱۸)

حفیظ کا فلسفہ دوستی ان کی زندگی میں شامل رہا۔ یہاں ان کے اس بیان کی ضرورت یوں پڑی کہ شیخ صاحب نے اپنے

گزشتہ خط میں کسی دوست کے ناخوشگوار فقرے کا تذکرہ کیا تھا۔ حفیظ صاحب نے اس کی وضاحت اس طرح کی ہے۔

''ایک دوست کے نام، ایک دوست کے خط میں سے جو فقرہ تم نے نقل کیا ہے وہ ''عقل اور وجدان'' کے ''عدم توازن'' اور ''عدم تعاون'' کا نتیجہ ہے۔(۱۹)

حفیظ بے شک تمام عمر اسی فلسفہ زندگی پر کاربند رہے۔ لیکن اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ بے شک ان کی ملاقات کا حلقہ وسیع تھا کہ ایک با اخلاق شخص ہر ایک سے اچھی طرح ملتا ہے۔ خاطر مدارات بھی کرتا ہے لیکن تعلق خاطر ہر ایک کے ساتھ نہیں ہو سکتا کہ دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا۔ وہ ایسے مقام پر تھے کہ جہاں ان کا واسطہ بہت سے لوگوں سے تھا لیکن دوستی ہر ایک سے نہیں۔

دوستی عام ہے لیکن دوست دوست ملتا ہے بڑی مشکل سے

اور جب کوئی دوست مل جاتا ہے تو پھر یہ دوستی چار دنوں کا کھیل نہیں بلکہ صدیوں کی داستان معلوم ہوتی ہے۔ یہ الگ بات کہ وقت اور فاصلے بے رحمی سے کام لیتے ہوئے جدائی اور تنہائی کا عذاب بخش دیں۔ یہ عذاب سہنا کوئی آسان مرحلہ نہیں۔

ہم ان سے بچھڑے ہیں جیسے اسی طرح سے حفیظ
تمام دوست بچھڑتے رہے تو کیا ہو گا

﴿پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے ''حفیظ ہوشیار پوری بیسویں صدی کی اردو غزل کے تناظر میں'' کے ایک باب سے اقتباس﴾

حواشی

۱۔ پیر حسام الدین راشدی پنبہ کجا کجا نہم، قومی زبان۔ دسمبر ۱۹۸۲، صفحہ ۳۱
۲۔ نصر اللہ خان ''کیا قافلہ جاتا ہے''۔ کراچی، مکتبہ تہذیب و فن ۱۹۸۴، صفحہ ۶۷
۳۔ سید محمد نواز، نقوش شمارہ ۱۰۷، مئی ۱۹۶۷، صفحہ ۳۱۲۔۳۱۱
۴۔ ''مقام غزل''، عرض مرتب شان الحق حقی، کراچی اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۷۳ء، صفحہ ۱۳۔۱۲
۵۔ ایضاً، صفحہ ۱۱ ۶۔ شان الحق حقی ''خود نوشت'' افکار، صفحہ ۲۲۔۲۳
۷۔ سید محمد نواز کا خط، مدیر نقوش کے نام شمارہ ۱۰۷ مئی ۱۹۶۷ء
۸۔ ایضاً ۹۔ ایضاً
۱۰۔ کیا قافلہ جاتا ہے۔ نصر اللہ خان۔ کراچی، مکتبہ تہذیب و فن ۱۹۸۴ء، صفحہ ۶۷
۱۱۔ ایضاً، ص ۷۹ ۱۲۔ قاضی محمد اختر جوناگڑھی۔ روزنامہ جنگ کراچی، ۱۴ دسمبر ۱۹۷۲ء،
۱۳۔ ایضاً، ۲۴ جنوری ۱۹۷۴ء، ۱۴۔ وفا راشدی ہفت روزہ چٹان، ۲۴ اپریل ۱۹۷۳ء،
۱۵۔ ناصر کاظمی ''خشک چشمے کے کنارے'' لاہور، مکتبہ دانیال ۱۹۸۶ء، صفحہ ۱۹۳
۱۶۔ خط، شیخ صلاح الدین از حفیظ ہوشیار پوری
۱۷۔ ایضاً ۱۸۔ ایضاً
۱۹۔ ایضاً

اقبال کے فن کو پرکھنے کا معیار

پروفیسر ایوب صابر

اقبال نے غالباً ۱۹۰۱ء میں کہا تھا:

تجھ کو اقبال ان سے کیا نسبت
دلی والے زبان والے ہیں!

اگلے چند برسوں میں اہل زبان سے ادبی معرکے کے دوران بھی اقبال نے اساتذۂ زبان سے ہمسری کا دعویٰ نہ کیا، البتہ یہ وضاحت کی کہ جو زبان ابھی بن رہی ہو اور جس کے الفاظ و محاورات جدید ضروریات پورا کرنے کے لیے اختراع کیے جا رہے ہوں، اس کے الفاظ و محاورات کی صحت و عدم صحت کا معیار قائم کرنا محالات میں سے ہے[۲]۔ جدید ضروریات کا تعلق علوم و فنون کی توسیع اور معاشی و معاشرتی نیز صنعتی و سیاسی ترقی کے ساتھ تھا۔ نئے نئے الفاظ، تراکیب اور اصطلاحات کی تخلیق کا عمل تو ترقی یافتہ زبانوں میں بھی جاری رہتا ہے۔ مثلاً انگریزی میں نئے الفاظ و محاورات اور نئی تراکیب و اصطلاحات کی شمولیت اب بھی جاری ہے۔ اس کے برعکس پانینی اور پتنجلی نے سنسکرت کے قواعد و ضوابط مرتب کر کے اسے ایک اعلیٰ معیار تو دیا لیکن قواعد کی انہی جکڑ بندیوں کے باعث سنسکرت کا ارتقا رک گیا اور وہ خواص تک بلکہ رفتہ رفتہ کتابوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اقبال نے اساتذۂ زبان کے روزمرہ و محاورہ کی پابندی کو بڑی حد تک اپنا شعار بنائے رکھا۔ ایسا انہوں نے، مصروفیات کے باوجود اور شعوری طور پر کیا[۳]۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اقبال نے نئے محاورات، نئے استعارے، نئی تراکیب اور نئی تلمیحات بھی وضع کیں۔ انہوں نے زبان کا ایک منفرد اور جدید قالب تیار کیا۔ غالب نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ بڑی شاعری کا یہ وصف ہے کہ وہ اپنا قالب خود تیار کرتی ہے۔ اس کی سند اساتذہ ماقبل کے ہاں تلاش کرنا یا اس تلاش پر اصرار کرنا لسانی شعور و آگہی کے منافی ہے۔

میر کے سادہ و مؤثر انداز بیان میں دہلی کا روزمرہ و محاورہ محفوظ و جلوہ ریز ہے۔ غالب نے وسعت بیان کے لیے فارسی تراکیب سے زیادہ کام لیا اور اردو کی شعری روایت کو اپنی جدت طرازی سے نکتۂ کمال تک پہنچا دیا۔ غالب کی طرح اقبال نے بھی فارسی الفاظ و تراکیب سے کام لیا ہے تاہم اقبال کا مسئلہ زبان غالب کی نسبت زیادہ پیچیدہ، زیادہ مرکب اور زیادہ متنوع تھا۔ غالب کے ہاں تفکر کا عنصر موجود ہے اور زندگی کے حقائق انہوں نے بھی بیان کیے ہیں تاہم اقبال کے ہاں ان حقائق کا بیان بکثرت ہے اور مفکر شاعر ہونے کی، اقبال کی حیثیت بہت نمایاں اور عالمی سطح کی ہے۔ عرش ملسیانی لکھتے ہیں کہ ''بیچارے اقبال کا حال یہ ہے کہ ایک مفکر اور فلسفی ہونے کے باوجود اسے ذریعۂ اظہار بہتر صورت میں نہ ملا''[۴]۔ یہاں ''بیچارے اقبال'' کے الفاظ توجہ طلب ہیں اور ''باوجود'' کا لفظ محل نظر ہے۔ اقبال نے مفکر اور فلسفی ہونے کے سبب وہ زبان استعمال نہ کی جو چغتائی بیگم کے تاثرات

کے لیے وضع ہوئی تھی۔ ''بیچارے'' کا اطلاق اقبال پر نہیں ملسیانی پر ہوتا ہے جو معترف ہیں کہ ''اب ہر چند زبان و بیان کے متعلق نظریے بدل چکے ہیں لیکن اس یادگار تصنیف (اقبال کی خامیاں) کو شائع کر دینا ہی مناسب ہے''[۵]۔ عرش ملسیانی کو احساس ہے کہ زبان و بیان کے متعلق نظریے بدل چکے ہیں اور ان کے والد کی تحریر کردہ کتاب کی حیثیت اب ایک ''یادگار'' کی سی ہے جو بڑی حد تک، بے جان اور بے وزن ہو چکی ہے۔

اہم تر اور بنیادی سوال یہ ہے کہ مواد اور ہیئت یا معنی و لفظ کا باہمی تعلق کیا ہے اور کیا یہ مناسب و ممکن ہے کہ روایتی مضامین کے لیے وضع کی گئی روایتی زبان، اعلیٰ و ارفع معانی و مطالب کے لیے استعمال ہو؟ اس ضمن میں یہ بات بھی پیش نظر رکھنی ضروری ہے کہ شعر کے پس منظر میں نظریۂ شعر بھی کارفرما ہوتا ہے۔ نظریۂ شعر اور معنی و فکر کے اعتبار سے اقبال کی زندگی بخش اور قوت خیز شاعری، دور تنزل کی شاعری سے جوہری طور پر مختلف ہے۔ اقبال نے اپنے مضمون بعنوان ''جناب رسالت مآب کا ادبی تبصرہ'' میں شعری تنقید کے اصل الاصول کی وضاحت کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ ''صنعت حیات انسانی کے تابع ہے، اس پر فوقیت نہیں رکھتی''۔ نظریہ شعر کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''یہ پیش پا افتادہ فقرہ..... کہ کمال صنعت اپنی غایت آپ ہے، انفرادی اجتماعی انحطاط کا ایک عیارانہ حیلہ ہے جو اس لیے تراشا گیا ہے کہ ہم سے زندگی اور قوت دھوکا دے کر چھین لی جائے''[۶]۔ اقبال کے نظریہ فن کی ''ضرب کلیم'' کی متعدد نظموں میں عمدہ وضاحت ہوئی ہے۔ اس ضمن میں ''سرود''، ''فنون لطیفہ''، ''شاعر''، ''شعر عجم''، ''ہنر وران ہند''، ''ایجاد معانی''، ''موسیقی'' اور ''شعر'' خاص طور پر قابل توجہ ہیں[۷]۔ اقبال کے معانی و افکار بھی خاص ہیں جن کی نشان دہی وہ ''اسرار کتاب'' اور ''حرف راز'' جیسی تراکیب سے کرتے ہیں[۸]۔ اقبال بہت جلد ایک نظام فکر سے وابستہ ہو گئے تھے۔ انہیں ایک نصب العین سے عشق تھا جسے نظر میں رکھے بغیر کلام اقبال پر تنقید کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا[۹]۔ اقبال کا سرمایہ فکر، غالب سمیت، انیسویں صدی اور اس سے قبل کے شعرا اساتذہ کے مضامین و مطالب سے دو امور میں مختلف ہے۔

انیسویں اور بیسویں صدیوں کے دوران مغربی علوم، افکار و نظریات اور صنعتی انقلاب کے اثرات نے، برصغیر میں، جدید اور قدیم کی کشمکش کو جنم دیا۔ اقبال قدیم اور جدید دونوں پر وسیع، گہری اور محققانہ نظر رکھتے تھے۔ جدید مغربی تہذیب کا انہوں نے براہ راست مشاہدہ و مطالعہ کیا تھا۔ مغربی افکار و نظریات کے علاوہ انگریزی ادب سے بھی ان کی وسیع و عمیق واقفیت تھی۔ ایک طرف علامہ اقبال کے پاس معانی و افکار کا یہ مواد تھا اور دوسری طرف اسلامی نظریہ و نظام زندگی کو انہوں نے نصب العین اور ''اسرار کتاب'' کی تفسیر و تلقین کو شعار بنا لیا تھا۔ انہوں نے مغرب کے علاوہ مسخ شدہ اسلام کو اسلام کی حقیقی روشنی میں پرکھا اور امت نیز انسانیت کو وہ منزل دکھائی جو اسلامی نشاۃ ثانیہ اور انسانی آزادی، مساوات اور اخوت کی ضامن ہے۔ اساتذۂ زبان کسی ایسی ذمہ داری کے شعور سے بے خبر اور لاتعلق تھے۔ یہ معانی و افکار اردو شاعری میں نئے اور انقلاب آفرین تھے۔ معترضین یہ نہ جانتے تھے کہ معانی و افکار کا اسلوب و پیکر شاعری سے ایسا ہی تعلق ہے جیسا جسم و جان کا ہوتا ہے۔ کسی شاعر کو پرکھنے کا معیار ہی یہ ہے کہ اس نے کیا کہا اور کس طرح کہا؟ اس کے معانی و الفاظ اور افکار و اسالیب ہم آہنگ ہیں کہ نہیں؟ اقبال نے عظیم افکار کو پیکر شاعری میں اس طرح ڈھالا ہے کہ ان کا کلام معجزۂ فکر و فن بن گیا۔ ان کی شاعری اس فکر و فن کی اکائی و یکتائی کا مظہر ہے۔

اقبال کے اہل زبان معترضین تادیر اس معجزۂ فن کا ادراک نہ کر سکے۔ اگرچہ اقبال شعری صنعت گری کو حیات انسانی

کے تابع رکھتے ہیں تاہم ان کا اسلوب شعر گوئی نہایت پرتاثیر اور اپنی مثال آپ ہے۔ اقبال کی زبان ان کے فکر سے ہم آہنگ اور اعلیٰ وارفع ہے لیکن معترضین جب اقبال کی زبان کو بزعم خود، درست کرتے ہیں تو معجزہ فن قائم نہیں رہتا اور اقبال کی زبان ان اہل زبان کی سطح پر آجاتی ہے جو قواعد سے واقف لیکن زبان کے تخلیقی استعمال سے ناواقف تھے۔ یہ نکتہ ایک مثال سے واضح ہوگا۔ اقبال کا شعر ہے:

روز حساب جب مرا پیش ہو دفتر عمل
آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر[۱۰]

اس شعر پر اعتراض کرتے ہوئے سیماب اکبرآبادی نے لکھا کہ "ردیف 'کر' صیغہ امر ہے۔ امر کا تعلق ہمیشہ زمانہ حال سے ہوتا ہے پھر 'جب دفتر عمل پیش ہو' کے ساتھ امر کا تعلق کیونکر ہو سکتا ہے۔ کہنا یوں چاہیے تھا کہ جب دفتر عمل روز حساب پیش ہو تو خود بھی شرمسار ہونا اور مجھے بھی شرمسار کرنا...... شعر ذرا غور کے بعد ہر پہلو سے اس طرح صحیح ہو سکتا تھا:

حشر میں دفتر عمل پیش ہے اس کو دیکھ کر
آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر"[۱۱]

بقول سراج لکھنوی "یہ دعویٰ ہی بے دلیل ہے کہ امر کا تعلق ہمیشہ زمانہ حال سے ہوتا ہے"[۱۲]۔ اقبال کا شعر ہر پہلو سے، حتیٰ کہ قواعد کے اعتبار سے بھی درست ہے اور اس کی زبان معیاری وارفع ہے لیکن سیماب کا اصلاح شدہ مصرع زبان و بیان کے اعتبار سے پست اور قبیح ہو گیا ہے[۱۳]۔ اقبال کے ترقی یافتہ فن کو تذکیر و تانیث، روزمرہ محاورہ، واحد جمع، ضمائر اور صیغوں وغیرہ کے تناظر میں دیکھنا ہے۔

اقبال کی اردو اور فارسی ادب پر گہری نظر تھی۔ عربی ادب سے ان کا قریبی تعلق تھا۔ وہ قرآن کی حکمت ہی سے نہیں، اس کے اسلوب سے بھی متاثر تھے۔ انگریزی ادب پر دسترس تھی۔ ایک حد تک سنسکرت اور جرمن ادب کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ اقبال اہم ترین ادبی روایات و معیارات سے آگاہ تھے۔ وہ زبان و ادب کے خلاقانہ استعمال کی استعداد بھی رکھتے تھے۔ ان کا فن اتنا ترقی یافتہ ہے کہ روایتی تنقیدی اصطلاحیں اس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں۔ قدم قدم پر محسوس ہوتا ہے کہ "آبگینہ تندی صہبا سے پگھلا جائے ہے"۔ صورت حال جب یہ ہو تو کسی ایک زبان کی ادبی تنقید کو معیار تصور کر کے کلام اقبال کا منصفانہ تجزیہ محال ہے۔ کلیم الدین احمد نے انگریزی شعرا کو معیار مان کر کلام اقبال کے خلاف فتوے صادر کیے ہیں۔ اقبال کے مقابلے میں چھوٹے شاعروں کو، ہر اعتبار سے، معیار ماننے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کلیم الدین کی تنقید تخریب بن گئی ہے۔ ڈاکٹر عبدالمغنی نے "اقبال اور عالمی ادب" لکھ کر موصوف کی، بجا طور پر خبر لی ہے۔

اقبال کی زبان میں بعض جدید لکھنے والوں نے بھی قواعد کی غلطیاں نکالی ہیں[۱۴]۔ جملہ اعتراضات کا احاطہ کرنا زیر نظر تحریر میں محال ہے۔ یہ خاصا وسیع کام ہے[۱۵]۔ روزمرہ و محاورہ اور امور قواعد کی رو سے کلام اقبال کو پرکھنا پرانا طریقہ ہے۔ اس سے اقبال کے ترقی یافتہ فن کا ادراک نہیں ہو پاتا لیکن اولاً زیادہ تر اعتراضات اسی ضمن میں ہیں اور ثانیاً قواعد زبان کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ صحت زبان کا بنیادی تعلق روزمرہ و محاورہ اور قواعد کے امور سے ہوتا ہے۔ اس ضمن میں اساتذہ زبان کو نظر انداز کرنا بھی مناسب نہیں۔ خود اقبال نے اہل زبان اساتذہ کی سند سے انکار نہیں کیا، البتہ جدید دور میں اساتذہ کی جگہ ترقی زبان کے اداروں نے مرکزی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اقبال نے اردو اور فارسی شاعری کے بنیادی عناصر اور کارآمد روایات کو قبول کیا ہے اور ان سے کام لیا ہے[۱۶]۔ تاہم اپنے فکری سرمائے کو شعری پیکر عطا کرتے ہوئے مروجہ الفاظ اور اصطلاحات کو اکثر نئے معنی دے دیے ہیں۔ متروک الفاظ، واحد جمع، تعقید، تذکیر و تانیث، حشو و زوائد، روزمرہ و محاورہ، عروض و قافیہ وغیرہ امور میں کلام اساتذہ کو پیش نظر رکھنا ضروری اور مفید ہے، تاہم اردو زبان ترقی کی شاہراہ پر گامزن رہی ہے۔ اس کی ترقی و توسیع میں اقبال کا اپنا حصہ وقیع ہے اور اقبال کو مستند ماننے میں تامل نہیں کرنا چاہیے۔ اقبال نے نئی تراکیب، نئے محاورے، نئی تلمیحات، نئے استعارات، نئی علامات اور نئی اصطلاحات وضع اور استعمال کی ہیں۔ ان سے بدکنے کی ضرورت نہیں۔ "اودھ پنچ" کا "صبح روشن" کی ترکیب پر اعتراض کرنا روا نہیں تھا[۱۷]۔ اسی طرح تذکیر و تانیث کے ضمن میں دہلی و لکھنو کا فرق و اختلاف معلوم و معروف ہے، چنانچہ کسی ایک دبستان کی پیروی کے بجائے اقبال، اپنے ذوق کے مطابق، "غار" یا "پرہیز" کو مؤنث کے طور پر لیں تو اس پر معترض ہونا نا روا ہے۔ انہوں نے بلبل کو مذکر باندھا ہے اور غالب و اقبال کے ہاں یہ لفظ مؤنث ہے[۱۸]۔ اس سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑتا۔ بہتر یہ ہے کہ ترقی اردو کے ادارے مشترکہ طور پر جملہ اختلافی امور کا حتمی فیصلہ کر دیں۔ ایسا کرتے ہوئے سب سے زیادہ اہمیت میر، غالب اور اقبال کو ملنی چاہیے۔ جو شاعر جتنا بڑا ہوتا ہے زبان پر اس کے اثرات اتنے ہی زیادہ ہوتے ہیں۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے لکھا ہے کہ "شکسپیئر اور غالب کا کام قواعد زبان کی پابندی نہیں ہے۔ یہ قواعد زبان کا کام ہے کہ ان کی پابندی کرے"[۱۹]۔ یہ ایک صائب رائے ہے اور اس کا اطلاق اقبال پر بھی ہوتا ہے۔

حوالے اور حواشی

۱۔ ڈاکٹر گیان چند نے اندازے سے اس مقطعے والی غزل کو ۱۹۰۱ء کے کلام میں جگہ دی ہے۔ (دیکھیے، ابتدائی کلام اقبال، صفحہ ۹۷)

۲۔ مقالات اقبال، صفحہ ۵۲

۳۔ علامہ اقبال نے سید سلیمان ندوی کے نام اپنے خط مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۹ء میں لکھا تھا کہ "کلام میں بہت سا حصہ نظر ثانی کا محتاج ہے، لیکن اور مشاغل اتنی فرصت نہیں چھوڑتے کہ ادھر توجہ کر سکوں، تاہم جو کچھ ممکن ہے کرتا ہوں، شاعری میں لٹریچر، بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمع نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہیں، مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس، اس بات کو مد نظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ آرٹ (فن) غایت درجے کی جانکاہی چاہتا ہے، اور یہ بات موجودہ حالات میں میرے لیے ممکن نہیں"۔ (اقبال نامہ، حصہ اول، صفحہ ۱۰۸)

۴۔۵۔ دیکھیے، عرض حال از عرش ملسیانی، مشمولہ "اقبال کی خامیاں"

۶۔ مقالات اقبال، صفحہ ۲۳۲

۷۔ ان پوری نظموں کا مطالعہ ضروری اور مفید ہے، تاہم اقبال کے نظریہ فن کی اجمالی وضاحت کے لیے چند منتخب اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں

جس روز دل کی رمز مغنی سمجھ گیا
سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے! (کلیات اقبال اردو، صفحہ ۵۷۷)
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا! (کلیات اقبال اردو، صفحہ ۵۸۱)
تاثیر غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم
اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی لے! (کلیات اقبال اردو، صفحہ ۵۸۹)
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار! (کلیات اقبال اردو، صفحہ ۵۹۱)
نوا کو کرتا ہے موج نفس سے زہر آلود
وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں! (کلیات اقبال اردو، صفحہ ۵۹۳)
وہ شعر کہ پیغام حیات ابدی ہے
یا نغمہ جبریل ہے یا صور سرافیل! (کلیات اقبال اردو، صفحہ ۵۹۵)

۸ اقبال کہتے ہیں:

وہ حرف راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفس جبرئیل دے تو کہوں (کلیات اقبال اردو، صفحہ ۳۱۹)

نیز: تھا ضبط بہت مشکل اس سیل معانی کا کہہ ڈالے قلندر نے اسرار کتاب آخر! (ایضاً، صفحہ ۳۴۴)

۹ اقبال کا عشق اساتذہ زبان کے عشق سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ انسانی عظمت و رفعت کے لیے ناگزیر بھی ہے۔ عشق کی آگ بجھ جائے تو مسلمان راکھ کا ڈھیر ہو جاتا ہے:

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے (کلیات اقبال اردو، صفحہ ۳۸۸)
شوق مری لے میں ہے، شوق مری نے میں ہے
نغمہ اللہ ہو میرے رگ و پے میں ہے (کلیات اقبال اردو، صفحہ ۳۸۸)
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی (کلیات اقبال اردو، صفحہ ۳۹۷)
نگاہ شوق میسر نہیں اگر تجھ کو
ترا وجود ہے قلب و نظر کی رسوائی (کلیات اقبال اردو، صفحہ ۵۷۳)

اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ اقبال کا عشق تصور خودی کا ناگزیر و نمایاں ترین عنصر ہے۔ عشق ہی دراصل جہد و عمل کا محرک جذبہ ہے

۱۰ کلیات اقبال اردو، صفحہ ۲۹۹

۱۱۔۱۲ اقبال کی صحت زبان، صفحات ۲۹۵۔۲۹۶

سراج نے میر کے اشعار نقل کر کے بتایا ہے کہ امر کا تعلق ماضی و مستقبل سے بھی ہوتا ہے۔

۱۳ تبدیل شدہ مصرعے کی پہلی قباحت یہ ہے کہ ردعمل ابھی پیش نہیں ہوا لیکن سیماب کا کہنا ہے کہ پیش ہے۔ دوسری قباحت یہ ہے کہ جب یہ بات بروز حشر خدا سے کہی جا رہی ہے تو ''حشر میں''۔ ''اسکو'' وغیرہ حشو و زوائد ہیں۔ سراج نے لکھا ہے کہ پیش ہونے میں دیکھنے کا مفہوم شامل ہے۔ چنانچہ ''دیکھ کر'' بھی زائد ہے۔ نیز دونوں مصرعوں میں ردیف 'کر' ہو گئی ہے جو خلاف فصاحت ہے۔ (دیکھیے: اقبال کی صحت زبان، صفحہ ۲۹۶)

۱۴۔ مثلاً دیکھیے: (i) ''اقبال۔ ایک مطالعہ'' از ڈاکٹر علی حیدر نیر مشمولہ ''اقبال۔ فکر و فن'' مرتبہ سید اطہر شاہ، ادارہ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ، ۱۹۸۸ء۔ (ii) اقبال مجدد عصر، ڈاکٹر سہیل بخاری، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۹۰ء۔

۱۵۔ یہ کام اتنا وسیع ہے کہ پی ایچ ڈی کی سطح پر اسے مکمل کرنے کی اب بھی ضرورت ہے۔ کچھ کام ہو چکا ہے۔ مثلاً علیم الدین احمد کے اعتراضات کا جواب ڈاکٹر عبدالمغنی نے دیا ہے اور گوشہ نشین کی کتب کا جائزہ راقم نے پیش کیا ہے۔ تاہم ''اقبال کی خامیاں''۔ رسالہ ''شاعر'' آگرہ (مئی جون ۱۹۳۵ء) میں شامل معتبر ضامنہ مضامین اور دوسرے متعدد مضامین ایسے ہیں جن کا بالاستیعاب جائزہ لیا جانا چاہیے۔ علاوہ ازیں اقبال کے فن پر کتب و رسائل میں اعتراضات بکھرے ہوئے ہیں۔ مزید تلاش سے مزید مواد مل سکتا ہے۔ محقق کے لیے ضروری ہوگا کہ اسے اقبالیات کے علاوہ زبان و ادب نیز لسانیات و صوتیات پر دسترس ہو۔ اسے لکھنو جا کر ''اودھ پنچ'' کا پورا ریکارڈ دیکھنا پڑے گا۔ اقبال کی فارسی شاعری پر زبان و بیان کے ضمن میں ہندوستان کے علاوہ ایران میں بھی اعتراضات ہوئے۔ ایرانی اہل زبان کے اعتراضات تلاش کرنے کے لیے طہران جانا بھی ضروری ہے۔

۱۶ مثلاً ردیف قافیے کے بارے میں اقبال لکھتے ہیں کہ ''غزل اور رباعی کے لیے قافیہ کی شرط تو لازمی ہے، اگر ردیف بھی بڑھا دی جائے تو سخن میں اور بھی لطف بڑھ جاتا ہے۔ البتہ نظم ردیف کی محتاج نہیں''۔ عروض کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''اگر ہم نے پابندی عروض کی خلاف ورزی کی تو شاعری کا قلعہ ہی منہدم ہو جائے گا''۔ (اقبال نامہ، حصہ اول، صفحات ۲۷۹۔۲۸۰)

۱۷ ''طلوع اسلام'' کا مطلع ہے:

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی افق سے آفتاب ابھرا گیا دور گراں خوابی!

اسلامی نشاۃ ثانیہ کا یہ ولولہ انگیز خیر مقدم ہے اور اس کے لیے ''صبح روشن'' کا پُر اثر استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔ فکر و بصیرت کی اس بلندی اور زبان و بیان کے اس اعجاز کی تحسین تو کجا ''اودھ پنچ'' نے اعتراض کیا کہ اور صبح روشن بھی نئی ترکیب ہے۔ دنیا صبح صادق اور صبح کاذب کے سوا کسی تیسری صبح سے ناواقف تھی۔ ہاں روز روشن البتہ زبان زد عام ہے۔ شاعر صبح روشن کا ابتدائی حصہ ہو، مگر مشکل یہ ہے کہ ہم اتنے جدید النظر نہیں جو دن کو تارے دیکھنے لگیں''۔ (بحوالہ اقبال کی صحت زبان، صفحہ ۲۶)

پہلے مصرعے میں ستاروں کی تنک تابی کا ذکر ہے جو دلیل صبح روشن ہے۔ دوسرے مصرعے میں ایک یقینی واقعے کو ماضی کے صیغے میں بیان کر دیا ہے اور یہ اسلوب قرآن حکیم سے ماخوذ ہے۔ قطع نظر اس کے کیا ''صبح روشن'' جیسی عمدہ و اثر آفرین ترکیب کو محض اس لیے ہدف اعتراض بنانا چاہیے کہ یہ ترکیب نئی ہے، جبکہ ہر ترکیب ابتدا میں نئی ہوتی ہے۔

۱۸۔ انیس کا مصرع ہے: بلبل چہک رہا تھا ریاض رسول میں۔ اقبال کہتے ہیں: ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا۔ مرزا غالب لکھتے ہیں کہ ''بلبل میرے نزدیک مؤنث ہے۔ جمع اس کی بلبلیں''۔ طوطی بولتا ہے۔ بلبل بولتی ہے۔ (بنام میر مہدی، اردوئے معلی، حصہ دوم، مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل، صفحہ ۹۷)

''برادرز کرامازوف'' کا اردو ترجمہ

ڈاکٹر سہیل احمد خاں

کہا جاتا ہے کہ ادب کا مطالعہ کرنے والوں کے زندگی کے بارے میں تصورات کی تشکیل میں انیسویں صدی کے روسی ادیبوں کی تحریروں کا بے حد گہرا اثر ہے۔ محبت، نفرت، جرم وسزا، انسانی تعلقات، جبر واختیار، سماجی اداروں اور انسانی مقدر کے بارے میں جو رویے پڑھے لکھے طبقوں میں رائج رہے ہیں ان کے پس منظر میں روسی ادیبوں کی تحریریں ایک فعال عنصر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کبھی نئی اور پرانی نسل کے جھگڑوں میں لگتا ہے کہ جھگڑنے والے ترگنیف کی ''فادرز اینڈ سنز'' کا تازہ تازہ مطالعہ کر کے آئے ہیں کبھی کوئی دانشور تاریخ پر بحث کرتا ہے تو لگتا ہے ٹالسٹائی کی ''وار اینڈ پیس'' کے اوراق پھر پھڑا رہے ہیں۔ جن روسی ادیبوں کا تذکرہ ہے وہ نثر نگار تھے یا یوں کہیے ناول نگار۔ گوگول، ترگنیف، گنچاروف، ٹالسٹائی، اور دستوئیفسکی ذرا سوچیے ان کے بغیر ہمارے ادبی شعور کے کیا معنی بنتے ہیں؟

بہت سے ناقدین ادب، ناول کی مملکت کی تقسیم ٹالسٹائی اور دستوئیفسکی کے درمیان کرتے ہیں۔ ٹالسٹائی ناول نگاری کی رزمیہ جہت کا باکمال فنکار تھا۔ مقدر اور انسان کے مابین کشاکش کی کہانیاں کہنے والا۔ اس کے فن میں زندگی کبھی روشن اور گرم دن کی طرح اور کبھی برفباری کے روز کی طرح ہے۔ زندگی کی خارجی تفصیلات کو جزئیات سمیت، ہستی کی دورنگی کے جملہ زاویوں کو ٹالسٹائی نے اس مہارت سے پیش کیا ہے کہ ناقدین کو ہومر کی یاد آئی۔ دستوئیفسکی خارجی کوائف سے زیادہ انسانی روح کی کیفیات کا فن کار ہے۔ نفسیاتی بوالعجبیاں، جذبوں کی کشمکش، فکر ونظر کا بحرانی منظر نامہ، یہ سب پیچدار سلسلے دستوئیفسکی کے ناولوں میں جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ وہ ناول نگار کے بھیس میں ڈرامہ نگار تھا اور اس پائے کا کہ شیکسپیئر کے علاوہ شاید ہی کوئی ڈرامہ نگار اس کے مقابل آ سکے۔ اس کی المیہ بصیرت زندگی کی ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی پرچھائیوں کا احاطہ کرتی ہے۔ ایک نیم تاریک فضا، انسانوں کے داخلی بحران کا مظہر بنتی ہے۔

ٹالسٹائی اور دستوئیفسکی کے کئی ناول اردو میں ترجمہ ہوئے۔ خود روس کے غیر ملکی زبانوں کے اشاعت گھر نے تراجم کرائے اور کچھ مترجمین نے جنوبی ایشیا میں اپنے طور پر بھی اس ضمن میں کام کیا۔ البتہ ٹالسٹائی اور دستوئیفسکی کے ضخیم ناول ''جنگ وامن'' اور ''کرامازوف برادران'' ہمارے باہمت مترجم شاہد حمید کی محبت اور ریاضت کے منتظر تھے۔ شاہد حمید صاحب نے چھ برس پہلے ''وار اینڈ پیس'' کا ترجمہ ''جنگ وامن'' شائع کرایا اور ادبی حلقوں سے داد پائی۔ اب انہوں نے ''برادرز کرامازوف'' کا ترجمہ ''کرامازوف برادران'' بھی شائع کرایا ہے اور یوں دو باکمال ناول نگاروں کے دو اہم ترین ناول شاہد حمید کی محنت سے اردو کے قارئین کی دسترس میں ہیں۔ جناب شاہد حمید نے کم وبیش نصف صدی پہلے گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم۔ اے انگلش کے طالب

علم کے طور پر سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی میں خواجہ منظور حسین مرحوم جیسے اساتذہ کی زیر نگرانی ترجمے سے جس محبت کا آغاز کیا وہ طویل تدریسی ذمہ داریوں سے ریٹائر ہونے کے بعد کچھ اس طرح شعلہ بنی کہ اس کی تپش اور چمک سے سنجیدہ ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو خوشگوار تعجب ہونے لگا۔ ان کے تراجم یکے بعد دیگر، شائع ہوئے۔ ایڈورڈ سعید کی ''فلسطین کا مسئلہ'' جین آسٹن کا مشہور ناول ''تکبر وتعصب''، ''ایک بیسٹ سیلر''، ''سوفی کی دنیا'' اور سب سے بڑھ کر ''جنگ وامن'' یہ ان کی ترجمے سے محبت اور خود اردو سے الفت کا منہ بولتا ثبوت بن گئے ہیں اور اب باآسانی کہا جا سکتا ہے کہ بیسویں صدی کے اردو کے اہم مترجمین میں شاہد حمید کا نام شامل کیا جاتا رہے گا۔

''کرامازوف برادران'' اس ضخیم ترجمے کو تخلیقات، لاہور نے شائع کیا ہے۔ صفحات چودہ سو سے اوپر اور قیمت سات سو روپے۔

دستوئیفسکی کی زندگی کے جو کوائف ضرور سامنے رہنے چاہئیں ان میں سے ایک تو اس کے باپ کا قتل ہے۔ اس کا باپ ڈاکٹر تھا مگر اس نے دو گاؤں خریدے اور بہت سے زرعی غلاموں کا مالک بھی بن گیا۔ دستوئیفسکی (پیدائش ۱۸۲۱ء) اٹھارہ سال کا تھا جب اس کے درشت مزاج باپ کو کچھ کسانوں نے قتل کر دیا۔ فرائڈ نے دستوئیفسکی پر جو مضمون لکھا اور جو تحلیل نفسی کی بنیاد پر ادبی مطالعے اور تنقید کے لیے نمونہ بنا اس میں فرائڈ نے دستوئیفسکی کی نفسیات کو سمجھنے کے لیے اس واقعے کو جو اس کے نزدیک دستوئیفسکی کے لیے ایک احساس جرم بن گیا، سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ کرامازوف برادران میں تو باپ کے قتل اور بیٹے پر اس قتل کے الزام کی کہانی ہی بیان ہوئی ہے یہ مشہور جملہ ''ہم میں سے کون ہے جس نے کبھی نہ کبھی باپ کو قتل کرنے کی خواہش نہیں کی'' ظاہر ہے فرائڈ کو اپنے نظریات کی تعبیر کے لیے اس سے بہتر مواد کہاں مل سکتا تھا؟

دوسری اہم واردات یہ ہے کہ دستوئیفسکی کا نوجوانوں کے ایک ایسے حلقے سے ربط قائم ہوا جو روس کے حالات بدلنے کے لیے منصوبے بناتا تھا۔ ۲۲ اپریل ۱۸۴۹ء کو دستوئیفسکی سمیت ان تمام نوجوانوں کو گرفتار کیا گیا اور طویل مقدمے کے بعد گولی سے اڑا دینے کا حکم ہوا۔ مگر ایک میدان میں اس سزا کے لیے جمع کرنے کے بعد انہیں بتایا گیا کہ ان کی سزائے برس کی قید ہے اور دستوئیفسکی کو اومسک کے دور افتادہ قید خانے میں بھیج دیا گیا۔ یہاں اس نے بار بار انجیل کا مطالعہ کیا اور اس کی ذہنی کایا پلٹ ہوئی۔ چار سال کے بعد کچھ پابندیوں کے ساتھ رہائی تو نصیب ہو گئی لیکن مرگی کا مرض بھی لگ گیا۔ (اس مرض کے حوالے سے بھی دستوئیفسکی کی تحریروں کی تفسیریں ہوئی ہیں) بہر حال ان تمام الجھنوں کے ساتھ ایک دور میں اسے جوئے کی لت پڑی جس نے معاملات کو اور خراب کیا۔ قرض خواہوں کے ڈر سے کبھی چھپنا کبھی فرار ہونا، صحت کی خرابیاں یہ زندگی ایک عذاب ہی تو تھی مگر زندگی کے آخری برسوں میں اس کی نئی شادی نے کچھ سنبھالا دیا۔ بیوی آنا (شادی کے وقت دستوئیفسکی پینتالیس سال کا تھا اور آنا بیس سال کی) نے اس کے مالی معاملات کی دیکھ بھال سنبھالی اپنے سے بھی، جوئے کی لت سے بھی نجات ملی۔ ۱۸۸۱ء میں ساٹھ سال کی عمر میں دستوئیفسکی انتقال کر گیا۔

''کرامازوف برادران'' دستوئیفسکی کا ضخیم ترین ناول ہے اور اکثر ناقدین کے خیال میں یہی خدا انسان اور سماج کے بارے میں اس کی فکر کی مکمل ترین ترجمانی بھی کرتا ہے۔ سخت گیر اور عیاش فیودر پاولووچ کرامازوف اور اس کے بیٹوں کی داستان جسے لکھنے کا ارادہ کرتے ہوئے دستوئیفسکی نے کسی خط میں لکھا تھا ''اب میرے ذہن میں ایک عظیم ناول کا نقشہ بن رہا ہے''۔ باپ کا قتل مختلف

بیٹوں کی فکری اور جذباتی ہچل، عیسوی راہب فادر زوسیما کی کہانی، کل کا مقدمہ، جرم وسزا کی نوعیت کے بارے میں پیچیدہ مباحث، دہریت اور مذہبیت کی متصادم رو ئیں۔ روسی سماج کے کچھ طبقوں کی تصویر کشی تو اس کتاب میں ملے گی ہی لیکن روسی آرتھوڈوکس چرچ کی مذہبیت اور روس میں اُس زمانے میں آنے والے نئے تصورات کے مباحث بھی ہر جگہ چھائے ہوئے ہیں۔ فکر ونظر کی لہر نہیں پورا طوفان ہے جو گزرتا چلا جاتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ دستوئیفسکی کی فکر کیا ہے تو بالکل سادہ سطح پر جواب یہ ہے کہ اس کا خیال تھا کہ روس ہی وہ جگہ ہے جہاں عیسائیت کی تعلیم اپنی اصل شکل میں موجود ہے۔ اس لیے یورپ کے زوال کے دور میں روس ہی یورپ کو زوال (مادیت، سائنسی تیقن، انسانی فطرت کے معصوم ہونے کے تصور، ترقی اور سماجی تبدیلی کے یوٹوپیا) سے بچا سکتا ہے۔ یہ خیالات ایسے تھے کہ اس زمانے کے آزاد خیالوں اور انقلاب کا خواب دیکھنے والوں کو پسند نہیں آ سکتے تھے۔ چنانچہ اعتراضات کی بوچھاڑ تو ہونا ہی تھی ایسے دانشور کم نہ تھے جو ٹالسٹائی پر اعتراض کرتے تھے کہ وہ ہم عصر صداقتوں کو چھوڑ کر نپولین کے حملے کے بارے میں لکھ رہا ہے اور دستوئیفسکی ان کے نزدیک مجنونانہ مذہبیت اور رجعت پسندی کی ترجمانی کر رہا تھا (خود سوشلسٹ انقلاب کے بعد روس میں دستوئیفسکی کے بارے میں بہت سے تحفظات کارفرما رہے اس کے ابتدائی ناولوں کو تو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا رہا مگر ''برادرز کرامازوف'' جیسے ناولوں سے گریز کیا جاتا رہا)۔ دستوئیفسکی کی فکر کس حد تک صحیح تھی اس پر بحث کا دائرہ مختلف ہوگا۔ دستوئیفسکی کا کمال تو اس کو ایک ایسی ڈرامائیت میں ڈھال لینے میں تھا جو کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ اس نے کہا کہ بھائی میں بھی حقیقت نگار ہوں بس میری حقیقت نگاری ذرا گہری ہے۔ دستوئیفسکی کو اپنے عہد کے نفسیات کے علم سے بھی دلچسپی تھی۔ جذبوں کی متضاد شکلیں اور خواب اس کی اس دلچسپی کا خاص موضوع تھے۔ ذرا ''کرامازوف برادران'' میں ''محتسب اعلیٰ''، ''روسی راہب'' کے ٹکڑے پڑھیے اور دیکھئے کہ دستوئیفسکی کی مذہبی فکر کیا ہے اور ''شیطان۔ ایوان فیودروویچ کا بھیانک خواب'' ملاحظہ کیجئے تو اس کی نفسیاتی بصیرت بے نقاب ہو۔

بہت سے ناقدین کو البتہ دستوئیفسکی کی زبان اور اسلوب سے شکایت رہی ہے ان کے خیال میں اس کا انداز تحریر ناہموار اور اکثر اکھڑا اکھڑا تھا۔ نابوکوف جیسے مبصرین نے تو اس سلسلے میں اسے گوگول اور ٹالسٹائی سے کوسوں پیچھے گردانا ہے۔ باختن جیسے ناقدین نے اس اعتراض کو رد کرنے کے لیے بھی بہت کچھ لکھ رکھا ہے پھر بھی اسلوب کی سطح پر شاید دستوئیفسکی واقعی اعلیٰ ترین روسی ادیبوں کے مقابل نہیں ہوسکتا مگر انسانی روح کے معاملات کو ڈرامائیت عطا کرنے میں کوئی اس کا ثانی نہیں۔ اس لیے جدید ادبی شعور اس کی طرف کھنچتا رہا ہے۔ وجودیت پسندوں نے تو اسے اپنا پیش رو قرار دیا۔ گوتھک ناولوں، جاسوسی انداز کے ناولوں، جرم وسزا کے قصوں سے کچھ عناصر لے کر اس نے جس پرشکوہ بیانئے کی تشکیل کی ہے وہ بھی تو اس کے بڑے آرٹسٹ ہونے کا ثبوت ہے۔

شاہد حمید صاحب نے اردو میں دستوئیفسکی کے اس سب سے اہم ناول کو ترجمہ کر کے اردو ادب کی اس شرمندگی کو ختم کیا ہے جو اب تک اس کا ترجمہ نہ ہو سکنے کی وجہ سے تھی۔ انہوں نے ناول کے ترجمے کے ساتھ طویل حواشی بھی لکھے ہیں جن میں بائبل کے حوالوں، چرچ کی اصطلاحات، روسی ناموں اور روسی ثقافت اور تاریخ کے متعدد گوشوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ اور یوں قارئین کے لیے ان چیزوں کے بارے میں جاننا آسان ہو گیا ہے جن کو جانے بغیر ناول کے بہت سے مقامات مبہم ہو جاتے۔

دستوئیفسکی کے مکاتیب اور اس کی ڈائریوں کے اقتباسات بھی ترجمہ کیے گئے ہیں جن سے ناول کے محرکات پر روشنی پڑتی ہے۔ محمد سلیم الرحمٰن کی ناول نگار کی زندگی کے بارے میں ایک اچھی تحریر بھی کتاب میں شامل کی گئی ہے۔ اس طرح ترجمے کو ایک علمی رنگ وروغن بھی مل گیا ہے۔

ظاہر ہے اتنے ضخیم ناول کے ترجمے میں کہیں کہیں ناہمواری کا احساس کچھ انوکھی چیز نہیں اور بعض مقامات پر اہل نظر کو شاہد حمید سے اختلاف بھی ہوسکتا ہے۔ کچھ غلطیوں کی نشاندہی بھی ضرور ممکن ہے۔ لیکن جو کچھ اردو کو ملا ہے وہ اس طرح کی خردہ گیری سے بہت قیمتی ہے۔ یوں چلتے چلتے ایک آدھ بات کی طرف میں بھی اشارہ کروں گا۔ شاہد حمید صاحب نے ان ترجمہ نگاروں کی اچھی خبر لی ہے جو ترجمہ کرتے ہوئے اصل کتاب کی تہذیبی فضا کو اپنے یہاں کی تہذیبی فضا کے کسی مخصوص لفظ میں ڈھال دیتے ہیں۔ مگر ایک جگہ عیسائی راہب لکشمی کی پوجا نہ کرنے کی نصیحت کرتا ہے۔ یقیناً یہاں مراد تو یہ ہے کہ دولت کی ہوس نہ کرو اور یہی مفہوم لیا بھی جائے گا مگر ہندو لکشمی کی پوجا واقعی کرتے ہیں جس کا پس منظر الگ ہے۔ اس لیے اگر یہاں دولت کی پوجا ہی ہوتا تو کیا زیادہ بہتر نہ تھا؟ اسی طرف ''پرلی طرف'' جیسے الفاظ ایسے نہیں کہ مستعمل اردو الفاظ ان کا متبادل نہ بن سکیں۔

''برادرز کرامازوف'' کے ترجمے سے اس بڑے ادیب کی سب سے اہم کتاب اردو کے قارئین کی دسترس میں آ گئی ہے جسے ٹامس مان نے ''مجرم ولی'' قرار دیا تھا۔

قائداعظم لائبریری کی مطبوعات

۱-ابتدائی فلکیات	خالد مسعود	-/20 روپے
۲-پودوں کی زندگی	خالد مسعود	-/30 روپے
۳-مسلمان اور سائنس	خالد مسعود	-/30 روپے
۴-عالم حیوانات	خالد مسعود	-/20 روپے
۵-کرہ زمین	خالد مسعود	-/20 روپے
۶-کلیاں میرے گلشن کی	عبدالرحمٰن خالد	-/20 روپے
۷-اصطلاحات حدیث	ڈاکٹر محمد سعد صدیقی	-/80 روپے
۸-علم حدیث اور پاکستان میں اس کی خدمت	ڈاکٹر محمد سعد صدیقی	-/100 روپے
۹-اسلامی آداب	سید عبدالرحمٰن بخاری	-/100 روپے
۱۰-اسلامی قانون کا نظریہ مصلحت	سید عبدالرحمٰن بخاری	-/190 روپے

ملنے کا پتا: قائداعظم لائبریری، شاہراہ قائداعظم باغ جناح لاہور

گوتم کے دیس میں۔تعارف اور تبصرہ

عنایت اللہ

''گوتم کے دیس میں'' ایک نہیں تین سفرنامے ہیں۔ ڈاکٹر امجد ثاقب کے اپنے الفاظ میں یہ نیپال میں گزارے چند شب و روز کی کہانی ہے جس کے تین بنیادی موضوع ہیں۔ نیپال، مہاتما بدھ اور غربت اور یہ ''ایک ایسی کتاب ہے جس میں ایک اجنبی دیس کے تذکرے کے ساتھ ساتھ غربت اور افلاس کا کرب بھی ہے اور اس کرب سے نجات کی امید بھی''۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ امجد ثاقب نے کہاں تک ان موضوعات سے انصاف کیا ہے۔ مشہور سفرنامہ نگار مستنصر حسین تارڑ جنہوں نے خود بھی نیپال کے سفر کا حال بیان کیا ہے، اس سفرنامے کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''اگرچہ میں نے بھی نیپال نگری میں چند روز قیام کیا تھا اور اس کا احوال لکھا تھا، ثاقب کی ''گوتم کے دیس میں'' پڑھ کر احساس ہوا کہ ہمارا احوال تو سرسری تھا اور اصل نیپال تو اب ان کی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ نروان کی کچھ روشنی ان کی تحریر کے راستے ہمارے بدن میں بھی سرایت کی۔ شکریہ!''

چونکہ میں خود بھی کچھ برس بطور سفیر پاکستان نیپال میں رہا ہوں، اس لیے میں نے ''گوتم کے دیس میں'' کو بغور پڑھا اور اسے بہت دلچسپ پایا۔

۲۱۳ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں نیپال کے بارے میں بہت سی معلومات کچھ اس انداز میں پیش کی گئی ہیں کہ قاری بے تکان اس کے جغرافیے اور تاریخ سے شناسائی حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔ ایک اقتباس:

''نیپال کی خوبصورتی کے اظہار کے لیے شاعر کا تخیل اور مصور کا موقلم درکار ہے۔ پہاڑوں، جنگلوں اور وادیوں کی صورت میں قدرت نے اس دھرتی پہ اس قدر حسن نچھاور کیا ہے کہ اس کا یہاں سمانا مشکل ہے۔ ڈیڑھ لاکھ کلومیٹر رقبہ پر مشتمل یہ ملک وسعت اور رقبہ کے اعتبار سے انگلستان کے برابر ہے لیکن دولت اور آسائش کی جو فراوانی انگلستان میں ہے وہ یہاں نہیں۔ سمندر سے بہت دور آسمان کی بلندیوں کو چھوتی ہوئی یہ ایک پسماندہ دھرتی ہے۔ جہاں زندگی محنت، مشقت، جفاکشی اور بھوک کا دوسرا نام ہے۔ سطح سمندر سے اس کی بلندی ستر سے لے کر ساڑھے آٹھ ہزار میٹر تک جا پہنچتی ہے۔ یہاں واقع پہاڑ ہر سال ایک سنٹی میٹر مزید بلند ہوتے ہیں۔ بلند ہونا ان کی سرشت میں ہے۔ مشرق، مغرب اور جنوب میں بھارت جبکہ شمال میں چین اسے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ لمبائی میں نوسو اور چوڑائی میں اوسطاً دو سو کلومیٹر یہ خطہ متوازی علاقوں میں منقسم ہے''۔

اور ''ماضی کے چند ورق'' کے تحت باندھے گئے ذیلی عنوانات یوں ہیں:

نیپال

مسکن آبائے انسان کب بنا دامن ترا

مہابھارت۔ کون سمجھے گا اس پہیلی کو

بدھ مت

اشوک اعظم

قدیم بادشاہت

نئے چراغ

موجودہ نیپال

مذہبوں کا سنگم

مستقبل

اگلا پڑاؤ

اس باب کا اختتام ان الفاظ کے ساتھ ہوتا ہے:

''کسی نے کہا تھا کہ نیپال میں دو سلطنتیں آباد ہیں۔ ایک ناپائیدار اور فانی انسانوں کی، دوسری غیر فانی پہاڑوں اور ان دیکھی شفاف جھیلوں کی۔ ان نیلگوں پانیوں کی جہاں ہر شام شفق گھلتی ہے اور تھکے ہارے پرندے پیاس بجھانے آتے ہیں۔ نیپال کے سفر میں آنکھیں ہی نہیں دل بھی کھلا رکھنا پڑتا ہے۔ اک طرف شہر، محل، مندر اور دربار دوسری طرف برف، کوہ پیمائی، کشتی رانی اور جنگل سفاری۔ ایک طرف انسان کی محنت دوسری جانب فطرت کے حسین نظارے! شوق کے کتنے ہی مرحلوں اور منزلوں کا نام نیپال ہے''۔

امجد ثاقب نیپال ایک کانفرنس میں شمولیت کے لیے گیا تھا۔ یہ کانفرنس انسداد غربت کی حکمت عملی وضع کرنے کے بارے میں تھی۔ غربت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب امجد نے مزدوروں، محنت کشوں اور جھونپڑی میں رہنے والے کسانوں کی زبان میں دیا ہے۔ مثلاً ''غربت تو رسوائی کا نام ہے۔ کسی کا مرہون منت ہونا، مدد مانگنے پر نفرت اور بے زاری کا اظہار، جیسے ہم کسی اور خدا کے بیٹے ہوں۔ غربت تو میرے گھر کی ہر اینٹ سے نظر آتی ہے۔ ٹوٹے ہوئے برتن، پھٹے ہوئے کپڑے، بچوں کی بے نور آنکھیں اور بیوی کا بجھتا ہوا یرقان زدہ چہرہ۔ غربت آزادی سے محرومی کو اور مستقبل کے خوف کا نام ہے۔ غربت عزت اور غیرت تک چھین لیتی ہے۔ میں ایک بدنصیب اور کمزور کسان کی بیٹی ہوں۔ گاؤں کا چوہدری کئی بار میری عزت لوٹ چکا ہے..... لوگ بھی آگاہ ہیں مگر کہیں سے

کوئی آواز نہیں اٹھتی..... میری عزت کا للنا اگر غربت نہیں تو یہ بے حسی ضرور غربت ہے''۔

غربت کیسے دور کی جاسکتی ہے؟ کتاب کے مطابق: ''یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک غریب افراد کو خواب غفلت سے جگا کر تنظیمی سطح پر منظم نہ کیا جائے۔ ان افراد کو منظم کرنے کے بعد انہیں ہنر، تربیت اور سرمایہ کی فراہمی سے ہی غربت کی دیوار میں شگاف ڈالا جاسکتا ہے۔ تنظیم و تربیت اور سماجی رہنمائی کے بغیر ان کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی''۔

اور کانفرنس کی سفارشات کا لب لباب:

''وفاق سے لے کر گاؤں کی سطح تک اقتدار عوام کے منتخب اداروں کے سپرد ہونا چاہیے۔ کیونکہ بلدیاتی ادارے ہی ریاست اور عوام کے درمیان حائل دوری کی خلیج کو پاٹ سکتے ہیں۔ مقامی حکومتوں کا مکمل تحفظ، ان کی آزادانہ نشوونما، ان کا تسلسل اور ارتقاء، انہیں فنی، مالی اور انسانی وسائل کی فراہمی، ان سے متعلقہ افراد کی تربیت کا انتظام، جوابدہی کا ایک مکمل اور شفاف طریقہ کار اور پھر ان اداروں کی نگہداشت کا جامع نظام مرتب ہونا چاہیے۔ سب سے اہم سفارش یہ تھی کہ غریب ترین افراد اور پسماندہ گروہوں کو قومی ادھارے میں شریک رکھنے کے لیے سماجی تحریک کے عمل کو وسعت دی جائے اور اس طریقے کے تحت منظم گروہوں کو مقامی حکومت اور دیگر اداروں سے باقاعدہ طور پر منسلک کیا جائے''۔

مگر یہ سب کیسے اور کب ہوگا؟ اس سورج کے طلوع ہونے میں کتنی دیر لگے گی؟ امجد ثاقب آج کل اسی قسم کے کام یعنی رورل سپورٹ پروگرام سے منسلک اور اسی کھوج میں گم ہے۔

غربت کانفرنس کی روداد ختم کرنے کے بعد کتاب مہاتما بدھ، اس کی تگ و دو اور عرفان کی طرف مڑ جاتی ہے۔ مصنف نہایت چابکدستی سے ہمیں انوپاما نامی گائیڈ اور بھکشو چرڈ میتھیو کی زبانی بدھ مت کی داستان سناتا ہے۔ مہاتما بدھ کی زندگی کے دروا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے نروان کی یادگار رات جو راز اس پر منکشف ہوئے اور کائنات کی چار اعلیٰ سچائیوں کا ذکر ایک دلنشین پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ مہاتما بدھ عارف کامل بننے کے بعد پانچ بھکشوؤں سے ملتے ہیں اور بدھ مت کی تعلیمات کا نچوڑ یوں انہیں بتاتے ہیں:۔

''زندگی کے سفر میں کامیابی چاہتے ہو تو دو انتہاؤں سے بچنا لازم ہے۔ ایک انتہا لذت پرستی ہے اور دوسری انتہا نفس کشی، یعنی انسان نہ تو اتھاہ لذتوں میں غرق ہو جائے اور نہ ہی خود کو صبر آزما ریاضتوں میں ہلاک کر لے۔ ان دو انتہاؤں سے بچتے ہوئے درمیانی راہ اختیار کرنا ہی اصل کامیابی ہے۔ یہی راستہ بصیرت، علم اور نروان کا راستہ ہے۔ اس درمیانی راستہ پہ چلنے کے لیے آٹھ اصول اپنانا پڑتے ہیں۔ وہ اصول ہیں صحیح سوچ، صحیح گفتگو، صحیح عمل، صحیح اطوار، صحیح کوشش، صحیح توجہ اور کامل استغراق''۔

کیا بدھ خدا کو مانتے ہیں؟ رچرڈ میتھیو نے اس سوال کا جواب یوں دیا:

''بدھ نے خدا کے بارے میں کوئی واضح اور صاف بات نہیں کہی لیکن خدا کے وجود سے واضح انکار بھی نہیں کیا۔ بدھ کی تعلیمات کا نچوڑ یہ ہے کہ انسان کو اپنے آپ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ خدا پر بھروسہ انسان کے لیے ممکن نہیں۔ کیونکہ خدا پر بھروسہ خود کو بھلا دینے کے مترادف ہے''۔

پھر اس نے ''کرم'' اور ''تناسخ'' کی تشریح کی اور کئی اور سوالوں کے جواب دیئے۔

لمبینی مہاتما بدھ کی جائے پیدائش ہے جہاں امجد اڑھائی ہزار سال پہلے کا منظر اپنے تصور میں لا کر مہاتما کی زندگی کے آخری لمحوں میں قاری کو اپنے خیالات اور احساسات میں شریک کر لیتا ہے اور گوتم کے آخری وعظ کو ایک آزاد نظم کی صورت میں ڈھال لیتا ہے۔ پڑھیے اور لطف اٹھایئے:۔

مرے عزیزو،

مجھے محبت سے تکنے والو،

مجھے عقیدت سے سننے والو،

مرے شکستہ حروف سے اپنے من کی دنیا بسانے والو،

مرے الم آفریں تکلم سے انبساط تمام کی لازوال شمعیں جلانے والو،

بدن کو تحلیل کرنے والی ریاضتوں پر عبور پائے ہوئے،

سکھوں کو تجے ہوئے بے مثال لوگو،

حیات کی رمز آخریں کو سمجھنے والو،.....عزیز بچو،.....میں بجھ رہا ہوں،

مرے عزیزو، میں جل چکا ہوں،.....

مرے شعور حیات کا شعلہ جہاں تاب بجھنے والا ہے

میرے کرموں کی آخری موت میری سانسوں میں گھل چکی ہے

میں اپنے ہونے کی آخری حد پہ آ گیا ہوں

.....تو سن رہے ہو، مرے عزیزو، میں جا رہا ہوں،

میں اپنے ہونے کا داغ آخر کو دھو چلا ہوں،

کہ جتنا رونا تھا، رو چلا ہوں

مجھے نہ اب انت کی خبر ہے، نہ اب کسی چیز پر نظر ہے

میں اب تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ نیستی کے سکوت کامل کے
جہل مطلق..... (کہ علم مطلق ہے)..... جہل مطلق کے
بحر بے موج سے ملوں گا تو انت ہوگا
اس التباسِ حیات کا، جو تمام دکھ ہے!
میں دکھ اٹھا کر..... مرے عزیزو،..... میں دکھ اٹھا کر
حیات کی رمز آخریں کو سمجھ گیا ہوں: تمام دکھ ہے
وجود دکھ ہے، وجود کی یہ نمود دکھ ہے
حیات دکھ ہے، ممات دکھ ہے
یہ ساری موہوم و بے نشان کائنات دکھ ہے
شعور کیا ہے؟ اک التزام وجود ہے، اور وجود کا التزام دکھ ہے
جدائی تو خیر آپ دکھ ہے، ملاپ دکھ ہے،
کہ ملنے والی جدائی کی رات میں ملے ہیں، یہ رات دکھ ہے،
کہ زندہ رہنے کا، باقی رہنے کا شوق، یہ اہتمام دکھ ہے،
سکوت دکھ ہے، کہ اس کے کرب عظیم کو کون سہہ سکا ہے،
کلام دکھ ہے، کہ کون دنیا میں کہہ سکا ہے جو مادرائے کلام دکھ ہے،
یہ ہونا، دکھ ہے، نہ ہونا دکھ ہے، ثبات دکھ ہے، دوام دکھ ہے،
مرے عزیزو، تمام دکھ ہے،

جیسا میں نے پہلے لکھا ہے اس کتاب میں قاری کی دلچسپی کے لیے بہت کچھ ہے۔ تاریخ ہے، جغرافیہ ہے، قدرتی مناظر کی تصویریں ہیں، دلکش مقامات سے روشناسی ہے۔ غربت اور اس کے حل کی تجویزیں ہیں۔ مذہب اور فلسفے سے متعلق بلیغ اشارات ہیں اور سب سے بڑھ کر گوتم کی زندگی اور اس کے ''سچ'' کا بیان ہے۔

آخری سوال کے ذیلی عنوان کے تحت امجد ثاقب واپسی کے جہاز میں اپنے ایک ہم سفر پیٹر سے پوچھتا ہے ''پیٹر مجھے بتاؤ کہ کیا یہ زندگی یہ دنیا بدلی جاسکتی ہے؟ کیا زندگی صرف دکھ ہے؟ کیا کہیں بھی سکھ کا سایہ نہیں؟'' ایک طویل سانس لے کر پیٹر کہتا ہے ''جناب میں اپنے قبیلے شہر وطن یا دنیا کو بدلنے کی خواہش نہیں رکھتا۔ میں تو صرف خود سے نبرد آزما ہوں۔ صرف اپنے آپ کو بدلنا چاہتا ہوں''۔ امجد کو ڈھلی خیل (نیپال) کی غربت کانفرنس کا سبق یاد آ گیا کہ تبدیلی کی لہر نیچے سے اوپر کی طرف سفر کرتی ہے۔ پہلے ایک

شخص بدلے گا پھر اس کا گھرانہ، پھر گلی محلہ، گاؤں، علاقہ، شہر اور پھر ساری دنیا۔ دنیا بدلنے والوں کو اس سفر کا آغاز اپنی ذات میں تبدیلی سے کرنا ہوگا۔

پھر امجد نے پیٹر کو یہ کہتے ہوئے سنا ''رہی دکھ کی بات..... تو دکھ ایک بہت بڑی حقیقت ہے لیکن زندگی اس سے بھی بڑی حقیقت کا نام ہے۔ میں ان لوگوں کی طرح ناشکرا نہیں جو روشنی میں رہتے ہوئے بھی اندھیرے سے خوف کھاتے ہیں۔ دکھ کا ڈر، دکھ میں مبتلا ہونے سے زیادہ بدتر ہے۔ دکھ اور مایوسی کا پرچار کرنے والوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا میں طلوع ہونے والا ہر نیا سورج اور ماں کی گود میں مسکراتا ہوا ہر نومولود بچہ اس امر کا اظہار ہے کہ خدا ابھی ہمارے مستقبل سے مایوس نہیں ہوا۔ لیکن خدا پہ کوئی یقین رکھے تب ناں!..... تم مسلم ہو تو پھر زندگی اور دکھ کے بارے میں یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہو۔ کیا تم قرآن نہیں پڑھتے وہاں زندگی اور کائنات کا تصور کیا ہے''۔ اور اس چونکا دینے والے سوال پر امجد اپنے احساس کا اظہار یوں کرتا ہے: ''پیٹر کا یہ سوال ہتھوڑے کی طرح بار بار میرے ذہن پر برسنے لگا۔ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا سوائے پشیمانی کے..... کھنڈوے دلی اور دلی سے لاہور کا مختصر سفر اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا۔ میں پیٹر کی طرف احسان مند نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ جس کی بدولت میری میراث مجھے واپس مل گئی۔ میرا ایمان میرا اعتماد لوٹ آیا''۔

امجد کی تحریر میں سادگی بھی ہے اور بھرپور اظہار بھی۔ رنگینی بھی ہے اور بے ساختگی بھی اور مقامات، واقعات، نظریات اور حالات کو یوں بیان کیا ہے کہ قاری بھی اس کا ہم سفر بن جاتا ہے۔

کتاب کا ذکر ختم کرنے سے پہلے میں ایک آدھ بات اور کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ کتاب میں امجد نے اپنے ''افسر اعلیٰ'' کی جن الفاظ میں ستائش کی ہے اس سے مصنف کی شخصیت کا ایک دلچسپ پہلو نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ ایک تبصرہ نگار کو شاید یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ لکھنے والے کے احساسات کے اظہار پر کوئی پابندی لگائے یا اس قسم کی رائے کا اظہار کرے مگر میں نے مناسب سمجھا کہ اس کا ذکر کر دیا جائے۔

دوسری بات، کتاب کے آخر میں مصنف نے اپنے مخصوص انداز میں پیٹر کا کندھا استعمال کرتے ہوئے بدھ مت کے بنیادی فلسفے کی اگر نفی نہیں تو اس کی اہمیت اور افادیت کم کرنے کی سعی کی ہے۔ اور اپنے مسلمان ہونے اور قرآنی تعلیمات کی برتری کی طرف واضح اشارہ کیا ہے۔ کیا یہ ضروری تھا یا اس کے بغیر بھی سفرنامہ مکمل اور کامیاب قرار دیا جاسکتا تھا؟ اس سوال کا جواب میں قاری پر چھوڑتا ہوں۔

''گوتم کے دیس میں'' اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ سنگ میل پبلشرز نے اسے چھاپا ہے۔ کتاب کی قیمت -/240 روپے ہے۔ یقیناً امجد ثاقب کے اولیں سفر میں یہ کتاب ایک سنگ میل قرار دی جائے گی۔

اتحاد

لکھنؤ سے شائع ہونے والا نادر رسالہ

رفاقت علی شاہد

امداد صابری مرحوم نے پانچ جلدوں پر مشتمل تاریخ صحافت اردو لکھی ہے۔ اسے ابھی تک اردو صحافت کی مفصل اور جامع تاریخ کا درجہ حاصل ہے۔ تحقیقی پہلو سے قطع نظر، اس تاریخ کی یہ خصوصیت نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ اردو صحافت اور اردو ادب کے بارے میں جس قدر اور جس طرح کا مواد مرحوم نے اس میں جمع کر دیا ہے، اس کی دوسری مثال کہیں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ قریباً چار ہزار صفحات پر پھیلی ان پانچ جلدوں میں مرحوم نے ہزاروں اخبارات، رسائل، گلدستوں اور صحافیوں کے بارے میں معلومات جمع کر دی ہیں۔ اس قدر مواد کی جمع آوری اور اسے تالیف کے رشتے میں پرونے کے لیے مرحوم کو قریباً چالیس سال کا عرصہ لگا۔ اس قدر مسلسل محنت اور صبر آزما حالات سے گزرنے کے باوجود وہ ''تاریخ صحافت اردو'' کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''میری تالیف کردہ ''تاریخ صحافت اردو'' کی تینوں جلدوں میں جتنے اخبارات و رسائل کا ذکر آیا ہے، ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اس زمانے میں بہت بڑی تعداد میں اخبارات و رسائل نکلے ہیں''۔[۲]

مرحوم کے اس اعتراف حقیقت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جانے ابھی اردو کے کتنے اخبارات، رسائل اور گلدستے ہوں گے جن کا ذکر ''تاریخ صحافت اردو'' میں تو کیا، اردو صحافت و ادب کی کسی تاریخ میں نہیں ملتا۔ آج کی نشست میں ایک ایسے ہی اصلاحی رسالے کا تذکرہ کیا جا رہا ہے، جس کا ذکر تو تاریخ صحافت و ادب میں نہیں ملتا۔

اس رسالے کا نام ''اتحاد'' ہے۔ یہ ''دل گداز پریس، لکھنؤ'' سے طبع ہوتا تھا۔ اس کے مہتمم سید حسن شاہ تھے جو لکھنؤ میں ''کارخانہ احسن التجارت'' کے بھی مالک تھے۔ یہ کارخانہ ایک قسم کا شوروم (Show Room) تھا جہاں ضرورت کی مختلف اشیا برائے فروخت موجود ہوتیں۔ اس وقت رسالے کے چھ شمارے بہ تفصیل ذیل پیش نظر ہیں:

۱۔	جلد اول۔ شمارہ: ۶	جون ۱۸۹۲ء	۲۸+۴ صفحات
۲۔	جلد اول۔ شمارہ: ۷	جولائی ۱۸۹۲ء	۲۸+۴ صفحات
۳۔	جلد اول۔ شمارہ: ۸	اگست ۱۸۹۲ء	۲۴+۴ صفحات
۴۔	جلد اول۔ شمارہ: ۹	ستمبر ۱۸۹۲ء	۲۰+۴ صفحات

۵۔	جلد اول۔ شمارہ: ۱۱	نومبر ۱۸۹۲ء	۳۲+۴ صفحات
۶۔	جلد دوم۔ شمارہ: ۵	مئی ۱۸۹۳	۲۸+۴+۴ صفحات

یہ شمارے ''ذخیرہ ضیائی'' مخزونہ اقبال اکادمی، لاہور میں محفوظ ہیں۔[۳]

رسالے کے سرورق کی تزئین کچھ اس طرح ہے کہ ایک چوکھٹے کے اندر سب سے اوپر جلی حروف میں ''اتحاد'' درج ہے۔ نیچے ''نمبر۔۔ بابت ماہ۔۔ جلد۔۔'' درج ہے۔ اس کے نیچے ''باہتمام''، پھر نئی سطر میں ''سید حسن شاہ مالک کارخانہ احسن التجارت و مہتمم اتحاد'' اور نیچے صرف ''نے'' لکھا گیا ہے۔ آخری سطر میں ''دل گداز پریس میں چھپوا کر لکھنؤ چوک سے شائع کیا'' کے الفاظ ہیں۔ تمام عبارت کو سرورق پر پھیلانے کے لیے سطروں کے درمیان مناسب اور یکساں فاصلہ چھوڑا گیا ہے۔ ''اتحاد'' کے علاوہ بقیہ تمام عبارت کا قلم یکساں اور ''اتحاد'' سے قدرے خفی لیکن جلی ہے۔ چوکھٹے کا حاشیہ دوہرا ہے اور اس کے حاشیوں پر ایک آرائشی ڈیزائن کے ذریعے سے سرورق کو سجایا گیا ہے۔

سرورق کی آرائش تمام شماروں میں یکساں ہے، جب کہ عبارت کے سلسلے میں مئی ۱۸۹۳ء کے شمارے میں محض یہ تبدیلی ملتی ہے کہ ''باہتمام'' کے بعد اگلی سطر میں ''سید حسن شاہ مالک کارخانہ احسن التجارت و مہتمم'' اور اس سے اگلی سطر میں ''اتحاد'' لکھا گیا ہے اور آخری سطر میں ''دل گداز پریس میں چھپ کر لکھنو سے شائع ہوا'' کے الفاظ درج ہیں۔ تمام شماروں کے سرو پشت اوراق ہلکے زرد رنگ کے کاغذ پر طبع ہوئے ہیں۔

اندرون سرورق کے صفحے پر تمام شماروں میں، سب سے پہلے ''اتحاد'' کا اشتہار اور ضوابط درج ہیں۔ بقیہ جگہ میں کتابوں اور دیگر اشیا کے اشتہار ہیں۔

اندرون پشت ورق کے صفحے پر کتابوں کے اشتہار طبع ہوتے رہے ہیں، جب کہ مئی ۱۸۹۳ء کے اندرون پشت ورق کے صفحے پر ''کارخانہ شیخ سخاوت حسین، چوک لکھنؤ'' کے عطریات اور ''کارخانہ احسن التجارت لکھنؤ'' مملوکہ سید حسن شاہ کے اشتہار ملتے ہیں۔

بیرون پشت ورق پر جون ۱۸۹۲ کے شمارے میں ''عرض'' کے عنوان سے ایک اشتہار ہے جس میں ''اتحاد'' کے نامہ نگاروں سے مضامین کے لیے اور قارئین سے ''اتحاد'' کے لیے اشتہارات اور اس کی خریداری کی درخواست کی گئی ہے۔ بقیہ تمام شماروں کے بیرون پشت اوراق پر ''کارخانہ احسن التجارت'' کا پورے صفحے کا اشتہار ملتا ہے، جبکہ مئی ۱۸۹۳ء کے شمارے کے اس صفحے پر قرآن مجید اور دیگر کتابوں کے اشتہار ہیں۔

صفحہ ایک پر سب سے پہلے ''فہرست مضامین'' درج ہے۔ اس کے بعد ''ایڈیٹوریل نوٹس'' ہیں۔ یہ التزام تمام شماروں میں ملتا ہے۔ جولائی ۱۸۹۲ء اور مئی ۱۸۹۳ء کے شماروں میں یہ نوٹس صفحہ ۴ تک چلے گئے ہیں۔ جب کہ بقیہ شماروں میں یہ نوٹس صفحہ ۲ تک ہیں۔ ان نوٹس میں اسلامی انجمنوں، موجودہ اور گزشتہ شماروں، معاصرین، سرسید اور شرر وغیرہم کے بارے میں بحثیں، مشاہدات، اطلاعات اور معلومات ملتی ہیں۔ ان میں سے کچھ نوٹس اس مضمون کے ساتھ شامل اشاعت کیے جا رہے ہیں۔

''فہرست مضامین'' میں صفحہ نمبر کا حوالہ درج نہیں کیا جاتا تھا۔ جون ۱۸۹۲ء اور مئی ۱۸۹۳ء کے شماروں کے علاوہ بقیہ

شماروں میں مضمون نگاروں کے نام بھی ''فہرست مضامین'' سے غیر حاضر ہیں۔

جون ۱۸۹۲ء کے شمارے میں ''اتحاد'' کے درج ذیل ضوابط درج کیے گئے ہیں:

''۱۔ ہر انگریزی مہینے کی ۲۵ تک یہ رسالہ شائع ہوگا۔

۲۔ قیمت والیان ملک و روسا، عظام سے پانچ روپیہ (صدر) انجمنوں سے تین روپیہ (ے ر) عام خریداروں سے

۳۔ بغیر وصول قیمت پیشگی، رسالہ کسی کے نام جاری نہ ہوگا۔ نمونہ کا پرچہ ۲ آنے ٹکٹ پر روانہ ہوگا۔

۴۔ جو انجمن خاص اپنی کارروائی کے جس قدر حصے علیحدہ خریدنا چاہیں اس کا تصفیہ نرخ کی خط و کتابت سے ہوگا۔

۵۔ اجرتی اشتہارات ۴ سطر کے حساب سے۔ زیادہ کے لیے نرخ کی خط و کتابت سے فیصلہ ہوگا۔

۶۔ انجمنوں کے ضروری اشتہار ایک بار مفت شائع ہوں گے۔

۷۔ جواب طلب خطوط کے لیے ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیے۔ بے رنگ خط واپس ہوں گے''۔

مئی ۱۸۹۳ء کے شمارے میں کل (۵) ضوابط درج ہیں۔ ان میں پہلے چار ضوابط مشترک ہیں۔ مئی ۱۹۸۳ء کے شمارے میں شائع ہونے والا پانچواں ضابطہ یہ ہے:

''۵۔ جملہ خط و کتابت بنام اشخاص ذیل ہونا چاہیے:۔

المشتہر۔ سید حسن شاہ مالک کارخانہ احسن التجارت و مہتمم اتحاد و سید برکات احمد، اڈیٹر اتحاد، چوک لکھنو۔''

اس سے پہلے ''اتحاد'' کا ذیل کا اشتہار درج ہوا ہے:

> ''اتحاد قومی جوش کا پتلا! ہمدردی کا آلہ! مسلمانوں کا دل سوز ''اتحاد'' نہ صرف مسلمانوں کے اجزائے پریشان کا مجموعہ دکھائے گا، بلکہ اہل اسلام کے کارناموں کی رپورٹ کرے گا اور ایسے دل چسپ مضامین آپ دیکھیں گے جو دل فریبی کے لیے مقناطیسی قوت رکھتے ہوں، جس میں دلی جذبات کی پراثر لطافت کوٹ کوٹ کے بھری ہوگی۔ قومی ہمدردان اور اسلامی انجمنوں کو چاہیے کہ ضرور اس پرچہ کو خریدیں''

جون ۱۸۹۲ء کا شمارہ جلد اول کا چھٹا شمارہ ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ''اتحاد'' کا اجرا جنوری ۱۸۹۲ء میں ہوا ہوگا۔

''اتحاد'' کے ۱۸۹۲ء کے شماروں میں بطور مدیر کسی کا نام درج نہیں۔ مئی ۱۸۹۳ء کے شمارے میں ''ضوابط'' کے تحت سید برکات احمد کو رسالے کا مدیر لکھا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۸۹۳ء میں سید برکات احمد رسالے کے مدیر بنے ہوں گے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب شرر انگلستان چلے گئے تھے۔ اگر بہ نظر غائر مشاہدہ کیا جائے تو ''اتحاد'' اور مولانا شرر کے درمیان ایک تعلق نظر آتا ہے۔ ذیل کے حقائق دیکھیے:

۱۔ رسالہ ''اتحاد'' دل گداز پریس لکھنو سے طبع ہوتا تھا۔

۲۔ ستمبر ۱۸۹۲ء کے شمارے میں اطلاع دی گئی ہے کہ ''ہمارے دوست مولوی عبدالحلیم صاحب شرر لندن تشریف لے جانے والے ہیں۔

۳۔ مئی ۱۸۹۳ء کے شمارے میں ''دل گداز'' میں مولوی شرر کے مضمون پر اخبار ''طوطی ہند'' میں شائع ہونے والے معترضانہ مضمون کا اڑھائی صفحات میں جواب دیا گیا ہے، اور ابھی یہ پہلی قسط تھی۔ اخبارات و رسائل میں تو آئے دن معترضانہ مضامین شائع ہوتے رہتے تھے (اور ہیں)، لیکن جواب ان ہی مضمونوں کا دیا جاتا ہے جن کا تعلق خود سے ہو۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شرر کا ''اتحاد'' سے ایسا تعلق تھا کہ ''دل گداز'' کے مضمون پر اعتراضات کا جواب اس میں دیا جاتا تھا۔ یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ یہ جوابی مضمون مئی ۱۸۹۳ء کے شمارے میں شائع ہوا اور شرر اس وقت لندن جا چکے تھے۔

۴۔ شرر نے اپریل ۱۹۰۴ء میں ''اتحاد'' ہی کے نام سے ایک پندرہ روزہ رسالہ جاری کیا۔[۴]

مذکورہ بالا حقائق سے یہ اندازہ بخوبی ہوتا ہے کہ ''اتحاد'' اور شرر میں کوئی تعلق ضرور تھا۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ رسالہ شرر کے ایما پر شروع کیا گیا ہوگا۔ شرر ۱۸۹۱ء میں حیدر آباد دکن چلے گئے[۵]۔ جب کہ ''اتحاد'' کا اجرا ۱۸۹۲ء میں ہوا۔ اس لیے یہ ممکن نہیں کہ شرر اس میں براہ راست شامل رہے ہوں، لیکن اندازہ ہے کہ رسالہ ان کی مشاورت سے ترتیب دیا جاتا ہوگا۔ کچھ عجب نہیں کہ اس کے ''اڈیٹوریل نوٹس'' بھی وہی لکھ کر حیدر آباد دکن سے بھجواتے ہوں۔ چنانچہ ان کے انگلستان جانے کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا ہوگا، لہذا سید برکات احمد کو رسالے کا مدیر رکھ لیا گیا۔ عین ممکن ہے سید برکات احمد کا تقرر شرر کے ایما سے ہی ہوا ہو۔ بہر حال یہ واضح نہیں کہ شرر کا ''اتحاد'' سے کیا تعلق تھا، لیکن اس امر کے قرائن موجود ہیں کہ شرر اور ''اتحاد'' میں کچھ تعلق ضرور تھا۔

اس سلسلے میں سب سے اہم حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۰۰ء میں شرر کے اہتمام سے ایک ماہ نامہ ''پردۂ عصمت'' کے نام سے شروع ہوا۔ اس پر بطور مدیر سید حسن شاہ کا نام تھا[۶]۔ اور یہی سید حسن شاہ ''اتحاد'' کے مہتمم و مالک تھے۔ اس سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ سید حسن شاہ اور شرر میں کچھ، بلکہ گہرا تعلق تھا۔ ظاہر ہے یہ تعلق ''اتحاد'' کے سلسلے میں بھی رہا ہوگا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ''اتحاد'' کا ذکر کسی تاریخ صحافت و ادب میں نہیں ملتا۔ البتہ مولانا عبدالحلیم شرر کے حالات میں مرزا محمد عسکری لکھتے ہیں:

> ''اپریل ۱۹۰۴ء میں آپ نے ایک نیا پندرہ روزہ رسالہ جاری کرنا شروع کیا جس کا نام ''اتحاد'' رکھا، اور اس کی غرض یہ تھی کہ ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات صاف کیے جائیں۔''[۷]

اس بیان سے اول تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سکینہ اور عسکری ماہ نامہ ''اتحاد'' سے لاعلم تھے، اور دوسرے یہ کہ ۱۹۰۴ء سے قبل ماہ نامہ ''اتحاد'' بند ہو چکا تھا۔ اسی لیے مولانا شرر نے ''اتحاد'' کو زندہ کرنے کے لیے اپنے پندرہ روزہ کا نام اسی رسالے کے نام پر رکھا۔ گویا ماہ نامہ ''اتحاد'' کے وجود سے اردو دنیا لاعلم ہی رہی۔

''اتحاد'' کے مہتمم سید حسن شاہ کے بارے میں بھی معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ان کے بارے میں محض یہی معلوم

ہوتا ہے کہ وہ لکھنو کے رہائشی اور تاجر تھے۔ کارخانہ احسن التجارت کے نام سے ان کا اپنا شوروم تھا جو چوک لکھنو میں واقع تھا۔ اس کارخانے کا اشتہار ''اتحاد'' کے شماروں میں مسلسل شائع ہوتا رہا۔ وہ ''اتحاد'' کے نام سے ایک ماہ نامہ بھی لکھنو سے شائع کرتے تھے۔ ۱۹۰۰ء میں لکھنو ہی سے ''پردۂ عصمت'' کے نام سے ایک اور رسالے کا اجرا کیا۔ ''یہ رسالہ برس دن تک نکلا''۸۔ شفقت رضوی اطلاع دیتے ہیں کہ اس رسالے پر سید حسن شاہ کا نام بطور ایڈیٹر درج ہوتا تھا۹، لیکن محسوس ہوتا ہے کہ سید حسن شاہ میں اتنی قابلیت نہیں تھی کہ کسی رسالے کو مرتب کر سکیں یا کچھ لکھ سکیں، ورنہ ''اتحاد'' پر بھی ان کا نام بطور مدیر ہوتا، نہ کہ بطور مہتمم۔ اندازہ ہے کہ ''پردۂ عصمت'' پر بھی ان کا نام بطور مہتمم درج ہوگا۔

انیسویں صدی عیسوی میں یوں تو سینکڑوں ادبی، علمی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، اسلامی، مذہبی، طبی اور معلوماتی رسالے جاری ہوئے، لیکن ''اتحاد'' اپنے مشمولات کی اہمیت اور انفرادیت کی بنا پر سب سے الگ نظر آتا ہے۔ یہ اس لحاظ سے اہم رسالہ ہے کہ اس میں ہر ماہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں مسلمانوں کی دینی اور اصلاحی انجمنوں کے اجلاسوں کی روداد یں شائع ہوتی تھیں۔ ان رودادوں کے مطالعے سے انیسویں صدی کے آخری عشرے میں مسلمانان ہند کی ان کوششوں سے آگاہی حاصل ہوتی ہے جو وہ عام مسلمانوں کی اصلاح، بہتری اور ترقی کے لیے کرتے تھے۔ ان کارروائیوں کی تفصیل میں جانے سے طوالت کا اندیشہ ہے، اس لیے ذیل میں مذکورہ چھ شماروں میں شائع ہونے والی رودادوں کی فہرست درج کی جاتی ہے:

الف۔ جلد اول، شمارہ نمبر ۶: جون ۱۸۹۲ء

۱۔ کارروائی انجمن اسلامیہ لاہور۱۰	از خان بہادر محمد برکت علی خاں (سیکرٹری انجمن) ص ۱۵ تا ۱۷
۲۔ کارروائی انجمن محمدی اہل حدیث کلکتہ (حصہ اول)	از شیخ رحیم اللہ سوداگر (سیکرٹری) ص ۱۸، ۱۹
۳۔ کارروائی انجمن صوفیہ سکندر آباد	از حاجی محمد عبدالرحیم مخاطب بہ مشرف علی شاہ صوفی۔ ص ۱۹ تا ۲۲
۴۔ کارروائی انجمن حمایت بیوگان اسلام بارہ بنکی	از ابوالمحاسن محمد اسحاق (منصرم انجمن) ص ۲۲ تا ۲۶
۵۔ کارروائی انجمن ہدایت اسلام رانا پور	از علی جان (اسسٹنٹ سیکرٹری) ص ۲۶، ۲۷
۶۔ کارروائی انجمن اسلامیہ بٹالہ	از غلام محمد (سیکرٹری) ص ۲۸

فہرست مضامین میں ''کارروائی یتیم خانہ اسلامیہ روہیل کھنڈ بریلی'' از سید اشفاق حسین (سابق ڈپٹی کلکٹر) کا اندراج بھی ہے، لیکن یہ کارروائی نہیں، یتیم خانہ مذکور کا اشتہار ہے۔ یہ اشتہار ضمیمہ دوم میں شامل کیا جا رہا ہے۔

ب۔ جلد اول، شمارہ نمبر ۷: جولائی ۱۸۹۲ء

۷۔ انجمن حجۃ الاسلام اور ہم (بہ صورت مضمون)	از محمد ہدایت رسول، ص ۱۵ تا ۲۱
۸۔ کارروائی انجمن اسلامیہ بانس بریلی (حصہ اول)	..... ص ۲۱ تا ۲۳
۹۔ رپورٹ انجمن حمایت اسلام مونگیر	..... ص ۲۳، ۲۴
۱۰۔ کارروائی کمیٹی عام ماہوار، انجمن اسلامیہ گونڈہ	..... ص ۲۴ تا ۲۶

واقع ۲۹ مئی ۱۸۹۲ء

۱۱۔ کارروائی انجمن ہدایت اسلام داناپور	..... ص ۲۶، ۲۷
مع لیکچر از منشی علی جاں اسسٹنٹ سیکرٹری انجمن (قسط اول)	
۱۲۔ محمڈن یونین آگرہ	از محمد عبدالسلام (جائنٹ سیکرٹری) ص ۲۷، ۲۸

ج۔ جلد اول، شمارہ نمبر ۸: اگست ۱۸۹۲ء

۱۳۔ کارروائی مجلس تائید مسلمانان جدید شہر بمبئی	..... ص ۹ تا ۱۳
۱۴۔ روداد اجلاس ہائے انجمن اسلامیہ جبل پور (حصہ اول)	از سید زین العابدین (سیکرٹری انجمن) ص ۱۳ تا ۱۸
۱۵۔ روداد سالانہ جلسہ عام انجمن حمایت اسلام بھاگل پور	از سبحان احمد خان (سیکرٹری) ص ۱۸، ۱۹
۱۶۔ کارروائی انجمن اسلامیہ داناپور	از حشمت داد خان (سیکرٹری انجمن) ص ۲۰، ۲۱
۱۷۔ کارروائی انجمن اہل حدیث کلکتہ	از شیخ رحیم اللہ سوداگر دہلوی (سیکرٹری انجمن) ص ۲۱، ۲۲
۱۸۔ کارروائی انجمن ہدایت اسلام، داناپور	از منشی علی جان ۱۱ (اسسٹنٹ سیکرٹری) ص ۲۲ تا ۲۴

د۔ جلد اول، شمارہ نمبر ۹: ستمبر ۱۸۹۲ء

۱۹۔ کارروائی انجمن خیر اسلام قصبہ سہاور ضلع انبالہ (قسط اول)	از سیکرٹری انجمن، ص ۱۲ تا ۱۵
۲۰۔ کارروائی انجمن اسلامیہ جبل پور (منعقدہ ۵ جون ۱۸۹۲)	از سید زین العابدین (سیکرٹری انجمن) ص ۱۵، ۱۶
۲۱۔ کارروائی انجمن اسلامیہ گونڈہ (واقع ۲۶ جون ۱۸۹۲)	از میر محمد مہدی (نائب سیکرٹری انجمن) ص ۱۶ تا ۱۸
۲۲۔ روداد اجلاس انجمن اسلامیہ سندیلہ	از سید نجم الدین احمد (سیکرٹری انجمن) ص ۱۸، ۱۹
۲۳۔ کارروائی انجمن ہدایت اسلام داناپور	از علی جان (اسسٹنٹ سیکرٹری) ص ۱۹، ۲۰

ہ۔ جلد اول، شمارہ نمبر ۱۱: نومبر ۱۸۹۲ء

۲۴۔ کارروائی انجمن تبلیغ اسلام حیدر آباد دکن (قسط اول)	از محمد ابراہیم عفو (پریس رپورٹر) ص ۹ تا ۱۲
۲۵۔ کارروائی انجمن اسلامیہ داناپور	از حشمت داد خان (سیکرٹری انجمن) ص ۱۲، ۱۳
۲۶۔ کارروائی انجمن اسلامیہ جبل پور	از سید زین العابدین شاہ (سیکرٹری انجمن) ص ۱۳ تا ۱۶
۲۷۔ کارروائی انجمن خیر اسلام سہاور (ضلع رپنہ)	از محمد اسحاق خاں (سیکرٹری انجمن) ص ۱۶

و۔ جلد دوم، شمارہ نمبر ۵: مئی ۱۸۹۳ء

۲۸۔ روداد اجلاس معمولی انجمن اسلامیہ جبل پور	از فرزند علی دبیر، ص ۱۷ تا ۲۱

رودادوں کے علاوہ رسالے میں مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ ان کی فہرست بھی درج کی جاتی ہے:

۱۔ ابوالعینا	از سید برکات احمد لکھنوی	ص ۳ تا ۱۴	جون ۱۸۹۲

۲۔ابراہیم حربی	ایضاً	ص۵تا۱۴	جولائی ۱۸۹۲
۳۔قاضی ابن ابی لیلیٰ و	ایضاً	ص۳تا۶	اگست ۱۸۹۲ء
ابوعثمان خالدی	ایضاً	ص۶تا۸	اگست ۱۸۹۲+ ستمبر ۱۸۹۲
۴۔ابوحاتم سجستانی	ایضاً	ص۸تا۱۲	ستمبر ۱۸۹۲ء
۵۔چندہ اور لورپول	ازسید عاشق حسین	ص۳،۴	ایضاً
۶۔اگر مسلمان ترقی کر سکتے ہیں تو کیوں کر؟	ایضاً	ص۴تا۶	ایضاً
۷۔چندہ اور لورپول	ایضاً	ص۳تا۵	نومبر ۱۸۹۲ء
۸۔مبارک ہیں وہ لوگ جو بے کسوں پر رحم کھاتے ہیں	ایضاً	ص۵تا۸	ایضاً
۹۔لیکچر	ازنواب محسن الملک محسن الدولہ مولوی مہدی علی خان بہادر	ص۱۶تا۳۲	ایضاً
۱۰۔امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ	ازسید برکات احمد	ص۱تا۱۶	مئی ۱۸۹۳ء
۱۱۔خطاب بہ طرف مسلمانان ہندوستان	ازسید احمد خان	ص۲۱تا۲۸	ایضاً

مضمون ''ابوالعینا'' کے بارے میں ''ایڈیٹوریل نوٹس'' میں لکھا ہے:

''ہمارے ناظرین اس پرچہ میں ابوالعینا کی سوانح عمری سے بہت خوش ہوں گے۔ قہقہوں کے مارے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے۔ یہ ظریف اور طباع متوکل کے زمانہ میں ایسا ہی تھا جیسے ہندوستان میں سید انشا۔ کیسے عمدہ عمدہ لطائف، کیسے دل چسپ فقرے، کس قدر بلیغ نکات۔ جس محفل میں جاتے تھے، گویا زعفران زار ساتھ لاتے تھے۔ امیر و وزیر، سب چھیڑ چھیڑ کے ان کی باتیں سنتے تھے اور لطائف و ظرائف سے مسرور ہوتے تھے۔ ہندوستان میں جو الفاظ فحش ہیں، وہ عرب میں ایک معمولی الفاظ سمجھے جاتے ہیں۔ اس تذکرہ میں ہم کو بہت الفاظوں کا صاف صاف ترجمہ کرنا خلاف تہذیب معلوم ہوا۔ اس وجہ سے جس قدر دل چسپی عربی زبان میں اس کی ہے، وہ جذبات ہم اردو لٹریچر میں پیدا نہ کر سکے''۔ (جون ۱۸۹۲ء، ص۱)

مختلف شخصیات کی جو سوانح عمریاں ''اتحاد'' میں شائع ہوتی تھیں، بعض لوگوں کا خیال تھا کہ انہیں علیحدہ کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔ اس پر اگست ۱۸۹۲ء کے ''ایڈیٹوریل نوٹس'' میں درج ذیل شذرہ ملتا ہے۔

''بعض احباب رائے دیتے ہیں کہ جو سوانح عمریاں اتحاد میں ماہوار درج ہوتی ہیں، وہ تین چار مہینے کے بعد مجتمع کر کے ایک کتاب کی صورت میں شائع کر دی جائیں۔ لہٰذا آئندہ سے ہم اپنے احباب کے حسب خواہ بندوبست کریں گے''۔

''اتحاد'' کے پیش نظر شماروں کے مشمولات کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں سرسید تحریک کے بارے میں بھی کافی مواد مل جاتا ہے۔ ''ایڈیٹوریل نوٹس'' میں سرسید اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے بارے میں معلومات اور سرسید اور محسن الملک کے خطبات کی اشاعت پیش نظر شماروں کے خاص مشمولات میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ محض چھے دستیاب شماروں کے مشمولات ہیں۔ اگر ''اتحاد'' کے دیگر شمارے بھی بہم ہو سکیں تو ان میں اسلامی انجمنوں کے ساتھ شرر، سرسید، اور سرسید تحریک کے بارے میں بڑا قیمتی مواد ملنے کی توقع ہے۔

''اتحاد'' کے متعلق مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اصل میں مسلمانان ہند کی اصلاحی سرگرمیوں کی تاریخ کے وہ زریں اوراق ہیں جن کی تفصیل کہیں اور نہیں ملتی۔ اس لحاظ سے ''اتحاد'' محض ایک کم یاب ہی نہیں، ایک اہم اور قابل ذکر رسالہ ہے۔

آخر میں دو ضمیموں کے تحت ''اتحاد'' کے پیش نظر چھے شماروں میں شائع ہونے والے اہم اشتہارات کتب اور ''ایڈیٹوریل نوٹس'' پیش کیے جا رہے ہیں۔ امید ہے یہ فائدے مند ثابت ہوں گی اور ان کے ذریعے سے بعض حقائق کا بھی علم ہو سکے گا۔

ضمیمہ اول — کتابوں کے اشتہار

۱۔رسالہ رفع الشتباہ عن صفات اولیا اللہ

یہ رسالہ تصوف کا جو اولیا اللہ کے پہچاننے کا آلہ ہے۔ جس میں ہر دعوے پر کتب دینیات و اقوال صوفیہ کرام کا حوالہ ہے۔ اولیا اللہ کے حظ و خال کے معائنہ کرنے کا آئینہ۔ کرامات و خرق عادات کے دیکھنے کا بلند زینہ ہے۔ خانقاہوں کے خلوت نشینوں کی عینی توجہ کے قابل۔ پیری مریدی کی کشتی کے کھیلنے والوں کی مراد کا ساحل ہے۔ گل تصوف کا خوشبو عرق۔ وحدت وجود، وحدت شہود کی تحقیقات کا عمدہ سبق۔ یہ رسالہ کھول کر بتلا دیتا ہے کہ اس صفات و سیرت کے حضرات ولی اللہ ہیں اور ایسے ایسے لوگ ہرگز ولی اللہ نہیں ہو سکتے ہیں۔ لکھنے میں اس رسالہ کے، لحاظ رکھا گیا ہے کہ اقوال صوفیہ کرام سے استدلال ہونا چاہیے۔ حجم ۱۴ جز۔ قیمت ۱۲؍ محصول ڈاک ذمہ خریدار ۱۲۔

المشتہر: ابوالمجد عبدالصمد۔ مدرس اول۔ مدرسہ محمدیہ، کمپ دانا پور، قریب جامع مسجد

(اندرون سرورق۔ جون ۱۸۹۲ء کے شمارے میں یہ اشتہار بہ آں صورت شائع ہوا۔ بعد کے شماروں میں (۱۸۹۲ء میں) یہ اشتہار مختصر کر کے شائع کیا جاتا رہا۔ اس کی اشاعت ہمیشہ اندرون سرورق کے صفحے پر ہوئی)۔

۲۔سواطع الالہام۔ یعنی بے نقطہ تفسیر قرآن

اس نادر تفسیر کا تذکرہ حلقۂ طلبہ و مجمع علما میں عجیب غرابت سے مشہور ہو رہا تھا۔ مدتوں اس کی داستان سننے سے ہر شخص ہمہ تن اشتیاق ہو گیا تھا۔ اگر کسی عالم کے پاس کسی سورہ کی تفسیر بے نقطہ ہوتی تھی تو اس کو ایک گوہر نایاب کی طرح رکھتے۔ گویا ایک عجیب تبرک تھا کہ اس کو کبھی کبھی نکال کر زیارت کرتے تھے۔

فی الواقع ایک کان علم اور صنعت اعلا ۱۴ ہے۔ شہنشاہ اکبر ہندوستان نے اس کے مولف علامہ ابوالفیض فیضی کو اگر تاج کرامت واعزاز سے سرفراز کیا تو بہت بجا تھا اور بقول ''ولی راولی می شناسد'' عالم ادیب کا اس کے جواہر پر فریفتہ ہونا لائق تھا۔ الحمدللہ کہ مطبع اودھ اخبار لکھنو کو اس کا نہایت خوش خط، صحیح نسخہ دستیاب ہوا۔ اور نہایت اہتمام سے جواہر رقم کتابت ۱۵ اور نفیس کاغذ پر اس کو طبع کیا۔ پیمانہ ۱۲۔۸ پر ۸۴۷ صفحات، ۴۹ جزو کلاں ہیں، اور قیمت مقررہ اس کے مقابلہ میں گویا مفت، یعنی دس روپیہ۔ محصول ڈاک ذمہ خریدار۔

۳۔ لغات کشوری

یہ مبسوط لغت کارخانہ اودھ اخبار نے کوشش اور سعی اور اہتمام اور صرف زر کثیر سے مرتب اور مدون کی ہے اور اس کی تالیف وترتیب میں دماغ سوزی کی گئی ہے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ فارسی زبان کی یہ سب سے پہلی ڈکشنری ہے جو اپنی ندرت، جامعیت اور طرز بیان میں بھی ایک خصوصیت رکھتی ہے۔ فارسی زبان کی دو ایک ڈکشنریاں تو پہلے بھی لکھی جا چکی ہیں مگر وہ ایسی کم مایہ تھیں جو ان علم دوست طلبہ کے لیے چنداں مفید نہ تھیں۔ جو بڑی بڑی درسی کتابیں پڑھتے جاتے ہیں، ان کتابوں سے صرف وہی طلبہ فائدہ اٹھا سکتے تھے جن کی تحصیل ابتدائی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ جس طرح یہ ڈکشنریاں تمام درسی لغات پر حاوی نہ تھیں، اسی طرح کنایات اور اصطلاحات سے بھی معرا تھیں۔ لیکن لغات کشوری میں چہارم سے زیادہ ایسے الفاظ ملیں گے جن سے مبتدی کیا، طلبہ بھی واقف نہ تھے۔ اس میں لغات جمع کرنے کا جو التزام ہوا ہے، ہو بہو انگریزی ڈکشنریوں کا سا ہے۔ ہر لغت کا حرف اول باب اور حروف ثانی فصل قرار دیا گیا ہے۔ اور تسلسل بیان میں لغت کے تین تین حرف التزاماً رکھے گئے ہیں، اور جہاں کہیں پہلے تین حرف برابر آ گئے ہیں، جیسے پنج ارکان، پنج مایہ، پنج گاہ، پنج نوبت وغیرہ ہیں، وہاں چوتھے حرف کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ اسی طرح پانچویں اور چھٹے حرف کا بھی التزام رہا ہے۔ اس کے علاوہ جو کتابیں اس لغت کا ماخذ ہیں، وہ بھی نہایت مستند اور معتبر ہیں۔ گو غیاث اللغات اس فن میں ایک بڑی مبسوط کتاب ہے، لیکن اس میں اس سے بھی تقریباً دو ہزار لغت زیادہ ہیں۔ میری رائے میں یہ لغت جس طرح طلبہ کو مفید ہے، اسی طرح شایقین علم لغات کو بھی نافع ہے۔ حجم ۵۹۴ صفحہ۔ قیمت عام دو روپیہ علاوہ محصول ڈاک۔

الشہر: مینجر مطبع اودھ اخبار، لکھنو۔ (دونوں اشتہار شمارہ جون ۱۸۹۲ء کے سرورق کے ص ۳ پر شائع ہوئے ہیں)

۴۔ احسن الخطب

یہ نہایت مختصر خطبہ جس کو آں حضرت ﷺ ہر جمعہ میں سورہ ''ق'' کی آیات ملا کر پڑھا کرتے تھے، اصلاح کردہ جناب مولوی عبدالحی صاحب مرحوم فرنگی محلی۔ قیمت مع محصول ار۔

۵۔ تحفۃ الاحباب

یہ رسالہ ظرافت آمیز استاد شاگرد کی بحث۔ قیمت مع محصول ۲ر۔

۶۔ شہید وفا

مہتمم دل گداز کا لکھا ہوا نیا ڈراما چھپ کر تیار ہو گیا جو پر اثر خیالات اور دل خراش جذبات کل ڈراما سے ظاہر ہیں، وہ اور کسی موجودہ تصنیف میں نہ نظر آئیں گے۔ شائق ناظرین فوراً درخواستیں روانہ فرمائیں۔ قیمت مع محصول فی جلد ۴ر۔ ۱۶

الشہر: مہتمم اتحاد

۷۔ صبح امید

مولوی شبلی کی پرجوش مثنوی۔ قوم کا مرثیہ۔ قیمت ۳ر

(نمبر ۴ تا ۷۔ جولائی ۱۸۹۲ء تا نومبر ۱۸۹۲۔ اندرون سرورق کا صفحہ)

ذیل کی نادر کتابیں۔ ایس۔ ابن علی مینجر اخبار نیر اعظم مراد آباد سے ملیں گی۔ ہر جواب طلب تحریر کے لیے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا چاہیے۔ ۱ر سے کم درخواست کے ساتھ قیمت پیشگی بھیجنا چاہیے۔

۸۔ تائید اسلام

اس نام کا رسالہ ہمارے مطبع سے رونیچریہ میں پہلے جاری ہوا تھا۔ اس کے مختلف پانچ نمبر موجود ہیں۔ ان میں سید احمد خان صاحب کے انکار معراج جسمانی اور انکار معجزات اور انکار وجود شیطان اور انکار رویت الٰہی اور انکار ولادت عیسیٰ بغیر باپ کا مدلل جواب ہے۔ یہ رسالے آپ ہی اپنے نظیر ہیں۔ مطالب کی خوبی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ قیمت ان پانچوں رسالوں کی ایک روپیہ چودہ آنہ۔

۹۔ احسن الاذکار فی مناقب غوث الابرار

اس میں جناب غوث پاک کے مناقب صحیحہ اور ان کے حواری، عادہ ۱۷ اور تمام سوانح عمری مفصل مذکور ہے۔ آں حضرت ﷺ سے یہ قول جو منقول ہے کہ آپ کا قدم ہر ولی کی گردن پر ہے، اس کو بڑی تقویت دی ہے اور اس امر کو بھی مفصل ثابت کیا ہے کہ آپ کی تعظیم تمام مشائخ نے کی ہے۔ اس کے بعد نسب شریف اور آبائے کرام کا تذکرہ۔ پھر حضرت کے طریقہ کا بیان اور حضرت کے ارشادات اور اخلاق اور مرید واصحاب وغیرہ کا ذکر ہے۔ حضرت غوث پاک کے ذکر میں آج تک ایسی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔ اس کی عبارت اردو عام فہم ہے۔ قیمت دس آنہ (۱۰ر)

۱۰۔ کنز الاخلاق لاہل الآفاق

یہ مقدس اور صحیح کتاب جناب مولوی مولانا عبدالرحمن خان صاحب کلیانی سپرنٹنڈنٹ وجج ریاست اوپور کی تالیف ہے جس میں اخلاق اور تہذیب یک مضمون کی حدیثیں بہت عمدگی کے ساتھ جمع کی گئی ہیں اور ہر حدیث کے دو ترجمے، ایک فارسی، دوسرا اردو میں ہے۔ جو لوگ متبع سنت ہیں، ان کے واسطے ایسی نادر و نایاب کتاب کی سخت ضرورت ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ اس کی دل سے قدر کریں۔ بچوں کی ابتدائی تعلیم کے واسطے بھی مفید ہے۔ قیمت ۱۲ر

۱۱۔ عمدہ اور دل چسپ کتابیں

حضرات ایک مختصر سی فہرست کتب موجودہ کی سردست پیش کرتا ہوں۔ جو صاحب خط و کتابت کریں گے، ان کی خدمت میں بذریعہ ڈاک بڑی فہرست روانہ کی جائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ ملک ان کتابوں کی طرف پورے شوق سے توجہ کرے گا۔ کیوں کہ یہی کتابیں ملکی اور نیز قومی اغراض میں اکسیر کا اثر رکھتی ہیں، اور یہی تصنیفات ہیں جنہوں نے ملک کو اعلیٰ خیالات کی طرف متوجہ کیا ہے۔

فہرست:

۱۔ دلکش حصہ اول ۶/	۲۔ دلگداز ۸۷ء، ۴/	۳۔ دلچسپ حصہ دوم ۸/
۴۔ مسدس حالی خورد ۴/	۵۔ بنات النعش حصہ دوم	۶۔ مراۃ العروس ۶/
۷۔ موعظ حسنہ ۱۰/	۸۔ عقد الجواہر ۱۹/۸	۹۔ مثنوی صبح خنداں ۸/
۱۰۔ مرقع لیلیٰ مجنوں ۸/	۱۱۔ عود ہندی رقعات مرزا غالب دہلوی ۱۰/	۱۲۔ جہانگیر
۱۳۔ فرنگیوں کا کچا چٹھا ۴/	۱۴۔ الف لیلہ باتصویر ۲۰	۱۵۔ جام سرشار ۴/
۱۶۔ دوحۃ الابصار للمعہ ۲۱/	۱۷۔ قائم نامہ ۶/	۱۸۔ دلکش حصہ دوم ۸/
۱۹۔ ناول ملک العزیز ورجنا ۴/	۲۰۔ صبح امید ۴/	۲۱۔ مراۃ العروس ۶/
۲۲۔ توبۃ النصوح ۹/	۲۳۔ محسنات یعنی فسانہ مبتلا	۲۴۔ نغمہ راز مع شب وصل و شب غم ۴/
۲۵۔ مثنوی نیرنگ خیال ۸/	۲۶۔ البرٹ بل ۸/	۲۷۔ بھول بھلیاں شکسپیر ۴/
۲۸۔ فیروز و گلنار ۱۰/	۲۹۔ عصمت ۸/	۳۰۔ آثار الصنادید مصنفہ ڈاکٹر سر سید احمد خان ۲۲
۳۱۔ فسانہ آزاد حصہ اول ۴/	۳۲۔ حصہ دوم للمعہ	۳۳۔ حصہ سوم للمعہ
۳۴۔ حصہ چہارم للمعہ		

علاوہ اس کے کل تصانیف حضرت جلال لکھنوی بھی مل سکتی ہیں۔ المشتہر: شیخ احمد علی کامل لکھنو، ڈاکخانہ منصور نگر۔

(۸ تا ۱۱ پشت ورق کا اندرونی صفحہ۔ جولائی تا نومبر ۱۸۹۲ء ہر دفعہ)

۱۲۔ کتب مفصلہ ذیل دفتر ''اتحاد'' سے مل سکتی ہیں

۱۔ آثار الصنادید۔ مصنفہ ڈاکٹر سر سید احمد خان ۴/

۲۔ رفع الاشتباہ عن صفات اولیاء اللہ۔ مصنفہ مولوی عبد الصمد صاحب بہاری مدرس اول دانا پور ۱۴/

۳۔ رزم بزم مولفہ منشی امراؤ علی صاحب ۴/

۴۔ جام سرشار۔ مولفہ پنڈت رتن ناتھ صاحب ۴/

۵۔ حسن اور انجلنا۔ مصنفہ مولوی عبد الحلیم صاحب شرر ۴/

۶۔ ملک العزیز اور ورجنا۔ ایضاً ۴/

۷۔ منصور اور موہنا۔ ایضاً ۴/

۸۔ شہید وفا۔ ایضاً

۹۔ جہانگیر۔ مولفہ منشی امراؤ علی صاحب

المشتہر: سید حسن شاہ مہتمم ''اتحاد'' چوک لکھنو۔ (مئی ۱۸۹۳ء۔ اندرون سرورق کا حصہ)

۱۳۔ عمدہ اور دل چسپ کتابیں

حضرات! مجھے یقین ہے کہ ملک ان کتابوں کی طرف پورے شوق سے توجہ کرے گا۔ کیوں کہ یہی کتابیں ملکی اور نیز قومی اغراض میں اکسیر کا اثر رکھتی ہیں اور یہی تصنیفات ہیں جنہوں نے ملک کو اعلا ۲۳ خیالات کی طرف متوجہ کیا ہے۔ آٹھ آنہ سے کم درخواست کے لیے قیمت پیشگی آنا چاہیے۔

فہرست:

۱۔ لیکچر اشاعت اسلام پر۔ جو نواب محسن الملک بہادر نے ۲۴ مئی ۹۲ء کو حیدر آباد میں دیا تھا۔ ۳/		
۲۔ مثنوی صبح امید قوم کا مرثیہ۔ ۳/	۳۔ مثنوی صبح خنداں۔ ۸/	
۴۔ مثنوی نیرنگ خیال۔ ۸/	۵۔ عود ہندی۔ رقعات مرزا غالب دہلوی۔ ۷/	
۶۔ مراۃ العروس۔ ۶/	۷۔ عصمت۔ ۸/	
۸۔ دفع البلیات۔ حصہ اول۔ مؤلفہ مولانا محمد علی صاحب کان پوری۔ ۶/		
۹۔ مراۃ الیقین۔ ایضاً۔ ۲/		
۱۰۔ رسالہ تحفۃ الاحباب۔ ۲/		
۱۱۔ احسن الخطب۔ مع استفتا مولوی عبد الحی صاحب مرحوم۔ ۱/		

(اندرون سرورق۔ شمارہ مئی ۱۸۹۳ء)

۱۴۔ نہایت واضح اور صحیح اور خوش خط قرآن مجید

یہ بے مثل قرآن مجید جس طرح پر وضاحت اور صحت میں بے نظیر ہے، اسی طرح خط اور کاغذ کے اعتبار سے بھی اپنا مثل نہیں رکھتا۔ فلس کیپ ۲۴ کاغذ پر یہ چھپا ہے اور وہ بھی اعلا ۲۵ درجہ کا ہے اور باوجود اس عمدگی اور صفائی کے قیمت کچھ بھی نہیں۔ صرف ۲۶/ میں۔ ملک کی ناقدریوں نے اس قدر قیمت گھٹانے پر ہم کو مجبور کیا ورنہ اس کی اصلی قیمت ۲۷ ہے ۲۸۔ اب بہت کم نسخے رہ گئے ہیں۔ شایقین منگوائیں، ورنہ افسوس ہوگا۔

اسناد صحت:

ان هذا القرآن ما صحيح مثله الا لان و تلوته عدة مرات اراه ما بقى فيه من الزلات جدى الله طابعه من نعماء الجنات. یعنی یہ قرآن ایسا صحیح ہے کہ آج تک اس مثل نہیں ہوا۔ کئی مرتبہ میں نے دیکھا۔ میرے نزدیک

کوئی غلطی نہیں ہے۔ خدا اس کے طبع کرنے والے کو نعمات جنت دے۔

مہر افضل العلماء اکمل الکملا جناب فیض مآب مولوی و مولانا محمد سعد اللہ صاحب مفتی و قاضی ریاست رام پور

سرعت رسول اللہ قاضی و خادم مفتی محمد سعد اللہ ۱۲۷۸ھ

اجلہ علمائے عصر و کملائے دہر، جناب فضیلت انتساب، مولانا شاہ عبدالحق صاحب کان پوری: ان ہذا القرآن صحیح۔ دستخط بیدہ۔ مہر

جناب مولوی حافظ لطف اللہ صاحب قاضی حال رام پور

ذالک الکتاب لا ریب فیہ صحیحہ علمنا ذالک بعد قراءتہ۔ محمد لطف اللہ۔ مہر

سرآمد ارباب فضل و حکمت مولوی حکیم علی حسین لکھنوی، ملازم رام پور: قراءۃ فوجدۃ صحیحا۔ علی حسین۔ مہر

جناب مولوی حافظ غلام نبی صاحب از عمدہ علماء و حفاظ، مدرس مدرسہ رام پور: تلوتہ فوجدتہ صحیحا۔ غلام نبی۔ مہر

مولوی محمد وجیہ صاحب رئیس العلمائے کلکتہ، مدرس اعلا ۲۹ مدرسہ عالیہ۔ مہر۔ محمد وجیہ

الغرض کسی نے لاریب فیہ، کسی نے لاشک فیہ مختلف مضامین میں دستخط کیے۔ تقریباً پندرہ ۳۰ سولہ دستخط و مہر، علماء و حفاظ کی ثبت ہیں۔ آرا، بہار، باندہ، رام پور کے علما اور حفاظ کی مہریں نمونہ کے لیے چند لکھ دیں۔

(بیرونی پشت ورق۔ مئی ۱۸۹۳ء)

۱۵۔ یادگار سلف

یہ کتاب ایک ضخیم ہوتی اگر پوری ایک جلد میں شائع کی جاتی۔ لیکن خادم نے بہ نظر آسانی ناظرین اور مذاق طبیعت کے خیال سے چند نمبروں پر تقسیم کر دی۔ اس میں حکما اور علما اور فقہا اور شعرائے اسلام کی سوانح عمریاں ہیں۔ ملک اس سے کہاں تک دلچسپی لے سکتا ہے یا کس قدر ضروری ملک کے واسطے ہیں اور خصوصاً اسلام کو اس کی کہاں تک ضرورت ہے، ان سب امور کا فیصلہ ہم آپ کے اوپر چھوڑتے ہیں۔ ہم کو صرف اسی قدر کہنا کافی ہے کہ یہ مفصلہ ذیل نمبر خادم سے یا منیجر دل گداز سے یا مہتمم اتحاد سے مل سکتے ہیں۔ نمبر کتب مفصلہ ذیل۔

نمبر ۱۔ سوانح عمری شیخ الرئیس ابو علی سینا۔ فی جلد ۶/۔ پچاس ۳۱ کے لیے فی جلد ۴/

نمبر ۲۔ ابراہیم حربی، ابو العنیان، ابن مسکویہ۔ ۴/۔ پچاس کے لیے فی جلد ۳/

نمبر ۳۔ ابن مبارک، ابراہیم موصلی، ابی لیلیٰ، فقیہ ابو عثمان خالدی۔ ۴/۔ پچاس کے لیے ۳/

اس کی تعریف کرنا کہ کس قدر دل چسپ ہیں، منگا کر دیکھ لیجئے۔ بذریعہ ویلیو ۲۳ تعمیل ہو سکتی ہے۔

المشتہر: سید برکات احمد لکھنوی۔ پھاٹک منشی دبیر الدولہ، ڈاک خانہ چوک ۳۳۔ (ایضاً)

اہم خبریں اور شذرات

''آزاد'' کے فاضل اڈیٹر نے نہایت قابلیت کے ساتھ، ایک غائر نظر سے اتحاد کی ۳۴ جانب توجہ فرمائی ہے اور ایسا قیمتی اور قابل قدر ریمارک کیا ہے جس کے ہم از حد شکر گزار ۳۵ ہیں۔ ہمارے فاضل اڈیٹر نے نہ صرف ہمیں کو نصیحت کی ہے، بلکہ قوم کو اتحاد کی جانب متوجہ کیا ہے۔ اسی طرح پر اگر ہمارے دیگر ہم عصر بھی توجہ فرمائیں تو بے شک اتحاد جس غرض سے شائع ہوا ہے، پوری کامیابی کے ساتھ ملک اور قوم کی خدمت کر تا دکھائے''۔

جن حضرات کو اتحاد کی خریداری کی بابت خطوط لکھے گئے اور پرچہ بھی اب تک جاری ہے، ان کے نام نامی پختہ طور پر درج رجسٹر خریداران ہوئے۔ لہذا امید ہے کہ اس کی قیمت کی طرف بھی توجہ فرمائی جاوے تا کہ ہم کو مکرر شکریہ کا موقع ملے۔

(جون ۱۸۹۲ء، ص ۲، ''اڈیٹوریل نوٹس'')

اشتہار

یتیم خانہ انجمن اسلامیہ روہیل کھنڈ، بریلی

بخدمت والیان ملک اور امرائے عظام و عام اہل اسلام ہندوستان، عرض ہے کہ انجمن اسلامیہ روہیل کھنڈ، بریلی کے اہتمام سے ایک یتیم خانہ ۱۸۸۸ء سے جاری ہوا ہے، جس میں فی الحال انتیس ۳۶ لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ جس قدر مستقل آمدنی یتیم خانہ (کی) ۳۷ ہے، وہ بہت ہی قلیل و ناکافی ہے۔ ممالک مغربی و شمالی یا اودھ میں صرف یہی ایک یتیم خانہ اہل اسلام کے بچوں کے واسطے ہے۔ ہر ایک ضلع سے یتیم داخل ہو سکتا ہے۔ چناں چہ گورنمنٹ کے ذریعہ سے دو ۳۸ یتیم کلکتہ سے اور دو ۳۹ لڑکیاں الہ آباد سے یتیم خانہ میں آ کر پرورش پا رہے ہیں۔ اس سے پیش تر، مسلمان بچے یا تو پادریوں کے قبضہ میں آ جاتے تھے یا آریہ سماج کے زیر انتظام پرورش پاتے تھے۔ جہاں ان کو کسی قسم کی دینی تعلیم نہیں ملتی تھی۔ ہم کو امید ہے کہ خیر خواہان قوم ضرور ایسے کار خیر کی امداد میں پہلو تہی نہ کریں گے۔ زیادہ حالات خط و کتابت سے معلوم ہو سکتے ہیں۔

راقم: سید اشفاق حسین۔ سابق ڈپٹی کلکٹر و صدر نشین، انجمن اسلامیہ روہیل کھنڈ، بریلی۔ (جون ۱۸۹۲ء۔ ص ۲۷)

''مہتمم اتحاد کا ارادہ مصمم ہے کہ ایک سفر ہندوستان کا اس غرض سے کرے تا کہ معلوم ہووے کہ اسلامی انجمنیں کس انداز پر چل رہی ہیں اور ان کے سیکرٹری اور ممبران کس گرم جوشی سے کام کر رہے ہیں جن کی چشم دید رپورٹ اتحاد شائع کرے گا۔''

=========

''ہمارے مقدس بزرگ وار جناب سر سید احمد خاں بالقابہ نے ہم کو بذریعہ مراسلہ کے (؟) اطلاع دی ہے کہ امسال (محمڈن) ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰ دسمبر ۹۲ء (۱۸۹۲ء) کو بمقام دہلی

منعقد ہوگا۔ ہمارے ہم دردان قوم اس جلسہ کی شرکت کی نسبت ازیبل (آنریبل) سیکرٹری صاحب کو اطلاع دیں اور چندہ سے امداد فرمائیں تاکہ کانفرنس کو سامان کے مہیا کرنے میں اندازہ ہو سکے''۔

========

''ہمارے دوست مولوی عبدالحلیم صاحب شرر کی نسبت لوگوں کو معلوم ہو چکا ہے کہ وہ لندن تشریف لے جانے والے ہیں لیکن اب تک جو حیدرآباد میں مقیم ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وقار الامرا نے انگریزی اتالیق سے دریافت کیا ہے کہ ان کے صاحب زادے کو دوسرے اتالیق سے ملنے کی کس قدر مہلت دی جائے گی اور اس کا جواب تار پر آئے گا۔ اس وقت ہمارے دوست شرر لندن تشریف لے جائیں گے۔''
(ایڈیٹوریل نوٹس، ص ۱، ستمبر ۱۸۹۲ء)

========

ریویو

نالۂ بسمل، مثنوی جانستان، بقای نسل (بقائے نسل)۔ یہ تینوں کتابیں ہمارے دوست اڈیٹر صاحب نیر اعظم، مراد آباد نے بہ غرض ریویو ارسال فرمائیں۔ نالۂ بسمل، جو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا قصہ ترجیع بند کے طور پر ہے، اور مثنوی جانستان، جو ایک واقعہ کا، ایک دل چسپ نظم میں فوٹو کھینچا ہے۔ ان دونوں کتابوں کی نسبت زیادہ غور کی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ نامۂ بسمل جس میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا واقعہ درج ہے، خود ایسا مقبول ہو رہا ہے جس کے لئے (لیے) بہت ضرورت تھی کہ ان واقعات کو بڑھایا جاوے۔ تاکہ اس کی دل گدازی بڑھ جاوے اور مشتاقین کے دل پر پورا اثر کرے۔ جس کے لائق مصنف نے اپنے حتی المقدور اچھا لکھا۔ مثنوی جانستان میں چوں کہ کوئی خیالی قصہ نہیں تھا، اس سبب سے اگر مثنوی کے پورے فرائض ادا نہیں ہوئے تو زیادہ نکتہ چینی کے قابل نہیں ہے۔ تاہم تھکے ہوئے دماغ کے لئے (لیے) دو گھڑی کا مشغلہ ہے۔ بقائے نسل کا مضمون البتہ دقیق اور محنت سے لکھا گیا ہے۔ ایک معمولی دماغ کے واسطے وہ زیادہ دل چسپ نہیں ہو سکتا ہے۔ تفصیلی طور پر شاید، مضمون بقائے نسل (بقائے نسل) کی نسبت ہم پھر کبھی لکھیں۔ یہ تینوں کتابیں، جو کہ دو گھڑی کے مشغلہ کے واسطے نہایت عمدہ ہیں۔ اڈیٹر صاحب نیر اعظم مراد آباد سے مل سکتی ہیں۔ نالۂ بسمل قیمت ۲ر، مثنوی جانستان قیمت ۲ر، بقائے نسل (بقائے نسل) ۲ر (ایضاً ص ۳، ۲)

انجمن ہیوگان کا ریویو اس بات کا ثبوت ہے۔ پبلک نے انجمنوں کی کارروائیوں سے دل چسپی لینا شروع کی اور ہمارے قابل بزرگ واروں نے اس طرف توجہ فرمائی ہے۔ (''ایڈیٹوریل نوٹس''۔ ص ۲، نومبر ۱۸۹۲ء)

سید حسن شاہ مہتمم اتحاد نے انجمنوں کے حالات دریافت کرنے کے لیے پورب کا سفر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہاں کی انجمنوں کی حالت آپس کے مذہبی جھگڑوں سے خراب ہے۔ خدا رحم کرے۔ (ایضاً)

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس۔ ہم کو نہایت مختصر لفظوں میں بیان کرنا چاہیے کہ اس کانفرنس کا، جو چھ برس سے ہر سال جمع ہوتی ہے اور مختلف امور پر مباحثہ کرتی ہے، اصلی مقصد کیا ہے۔ ہماری سمجھ میں اس کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ ''مسلمانوں کو اپنی ترقی کے لیے کیا کرنا چاہیے''۔

جس قدر تجویزیں پچھلے اجلاسوں میں پیش ہوئیں، جس کو (جن کو؟) ہم نے مختصر لفظوں میں بیان کیا، مگر اب تک کسی اجلاس میں عام خیالات کی نسبت اس امر کے کہ ''مسلمانوں کو اپنی ترقی کے لیے کیا کرنا چاہیے'' ظاہر نہیں ہوئے ہیں۔ اب کے اجلاس محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا دہلی میں ہونے والا ہے اور جس میں امید ہے کہ نہایت عالی رتبہ اور اعلا (اصل اعلے) خیال کے لوگ جمع ہوں گے اور جو مسلمانوں کے تنزل اور ان کی مفلسی اور ان مشکلات سے، جو بسبب افلاس پیش آتی ہیں، بخوبی واقف ہوں گے۔ اس اجلاس میں متعدد بزرگوں سے اس امر پر رائیں لی جائیں کہ مسلمانوں کو اپنی ترقی کے لیے کیا کرنا چاہیے، تاکہ یہ بات معلوم ہو کہ مسلمانوں کے خیالات اس امر کی نسبت کیا ہیں اور مسلمانوں کی ترقی کے لیے وہ کون سی راہ اور کون سا طریقہ اختیار کرنا پسندیدہ خیال کرتے ہیں۔

اس لیے ہر ایک بزرگ سے جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں بطور ممبر کے شریک ہوں، یہ درخواست کی جاتی ہے کہ امر مذکورہ کی نسبت مختصر طور پر اور صاف صاف اپنی رائے تحریر فرما کر سیکرٹری کو عنایت فرمائیں اور جو ممبر تشریف نہ لائیں، وہ اپنی رائے تحریر فرما کر سیکرٹری پاس بھیج سکتے ہیں۔ ایک دن خاص ان رایوں کے پڑھے جانے کے لیے مقرر ہوگا اور اگر ممبران کانفرنس پسند فرمائیں گے تو ان سب رایوں کی نسبت رائے لکھنے کو ایک سلیکٹ کمیٹی مقرر کی جائے گی۔ اس تدبیر سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ بزرگان قوم کی عام رائے کی نسبت طریقہ ترقی حالت مسلمانان معلوم ہوگی اور ان تدبیروں کے اختیار کرنے پر جو مفتح ہو جائیں، کافی توجہ کی جا سکے گی اور خیالات کا انتشار، جو بالفعل در باب ترقی حالت مسلمانان ہو رہا ہے، کیا عجب ہے کہ اس تدبیر سے رفع ہو جائے اور سب لوگ اس امر پر متفق ہو کر ترقی حالت مسلمانان پر کوشش کریں۔ ہماری انجمنیں کوشش فرمائیں کہ اپنی اپنی رائے متذکرہ بالا امور پر صائب دے کر سیکریٹری محمدن (محمڈن؟) ایجوکیشنل کانفرنس کی خدمت میں بھیج دیں۔ (ایضاً)

ڈاکٹر سرسید احمد خان کے التماس بجانب اہل اسلام، جو اس غرض کے ثابت کرنے کے لیے ہے کہ اہل اسلام اپنے مرض سے آگاہ تو ہوئے ہیں مگر اس کا علاج نہایت ناواقف طبیبوں کے ہاتھ سے ہو رہا ہے، جس سے اس کا اندیشہ ہے کہ مرض روز بروز بڑھتا ہی جائے گا اور اس کے علاج کا جو طریقہ ہے، وہ مفید کار نہیں، وہ اس مضمون کو مختلف پیرایوں میں بیان کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایک ریگستانی زمین کو اس طریقے سے ہم سرسبز (و) شاداب نہیں کر سکتے کہ ایک ایک لوٹا پانی ہم اس وسیع میدان میں ڈالیں جہاں ایک بحر ذخار کی آب شاری کی ضرورت ہے۔ وہ صاف کہتے ہیں کہ ہماری منتشر قوتوں سے جدا جدا کوشش کرنے سے کوئی نتیجہ کام نہیں ہو سکتا۔ متحدہ قوت پیدا کرنے کی نسبت وہ تحریک کرتے ہیں اور درحقیقت اگر اہل اسلام کو ضرورت ہے تو اسی امر کی۔ (ایڈیٹوریل نوٹس۔ ص ۲، مئی ۱۸۹۳ء)

دل گداز کے بعض مضامینوں کی نسبت اکثر نافہموں نے اعتراض بھی کرنا شروع کیے مگر اس کا جواب (جواب جاہلاں باشد خاموشی) کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔ ''خاندان نبوت'' ایک یہی مضمون ہے جس کی نسبت اخبار طوطی ہند میں ایک مراسلہ بہت ہی شد و مد کے ساتھ لکھا گیا اور جس شان سے وہ شروع کیا گیا، افسوس اس کے ناقابل مراسلہ نگار نے اس کو اتمام کو نہ پہنچایا۔ ایک منصفانہ تحریر میں ذاتی حملہ اور عورتوں کے سے طعن تشنیع ایک مہذب تحریر میں کیا معنے؟ محققانہ نظر سے دیکھنا ایک دوسری چیز ہے،

اور صرف طعنے دینا، یہ دوسری مد ہے۔ تحقیق کے معنے تو یہ ہیں کہ جن امور پر اس مضمون میں نوٹ کیے گئے تھے، اس کو ثابت کیا ہوتا کہ فلاں حدیث موضوع ہے، فلاں راوی مطعون ہے، فلاں قول بالکل غلط ہے۔ کسی تاریخ کے حوالہ سے لکھا جاتا تو ہم بھی جانتے کہ مراسلہ نگار صاحب بڑے محقق ہیں۔ آتا جاتا خیر صلا، مگر لگے بے تکی صلواتیں سنانے۔ خود یہ کہ دنیا کے ایڈیٹر دل گداز کو شرافت نسبی کے معنوں اور مفہوم سے بے خبری (ہے) یا عرب کے قبائل اور حالات سے اس کو اطلاع نہیں، یا وہ علم حدیث سے بے بہرہ ہے، یا تطبیق ۴۰ احادیث سے بے نصیب ہے۔ اور دیگر احتمالات کافی نہیں ہو سکتے ہیں، جب تک کہ اس کا ثبوت آپ نہ دیں۔

ہم کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ مراسلہ نگار صاحب نے لکھتے وقت اپنے مضمون کو خود بھی سمجھا ہے یا نہیں۔ اس مضمون میں مخالفت کی کیا بنا ہے؟ یہ نہیں معلوم ہوتا۔ اگر یہ فرمایئے کہ مولوی عبدالحلیم صاحب نے گبن (Gibben) کے مفہوم کو نہیں سمجھا، تو یہ نہیں بتایا کہ وہ خود کیا سمجھے۔ سیادت کی نسبت اگر کوئی امر زیر بحث ہے تو وہ بتاتے۔ اگر کوئی سقم تاریخی ہے تو اس کو تحریر فرماتے، مگر ان میں سے تو جناب محترم مراسلہ نگار صاحب نے کچھ بھی نہیں لکھا ہے۔

ایڈیٹر دل گداز نے صرف اس قدر لکھا ہے کہ خاندان نبوت نے شرافت نسبی، دیگر اقوام سے حاصل نہیں کی، اور نہ اہل اسلام میں شرافت نسبی کوئی چیز سمجھی گئی۔ امام زین العابدین کی نسبت جو کچھ لکھا، وہ گبن کے خیال کی توضیح تھی، جس سے گبن کا یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ خاندان نبوت میں عجمیوں کے خون سے شرافت حاصل کی گئی۔ اسی مضمون کو تھوڑی سی تفصیل اور توضیح کے ساتھ لکھا۔ اڈیٹر دل گداز نے صرف اسی مضمون کو ثابت کیا ہے کہ خاندان نبوت میں شرافت ذاتی ہے اور صفاتی شرافت، جیسا کہ گبن کا خیال ہے، کوئی مؤثر نہیں اور نہ عجمی خاندان کی آمیزش سے شرافت پیدا کی گئی ہے۔ اس کو تین دلیلوں سے غیر موثر ثابت کیا۔ اول: عرب اپنی شرافت سب سے اعلیٰ سمجھتے ہیں اور اپنے نسب کو سب سے افضل جانتے ہیں۔ دوسرے: اہل اسلام میں شرافت نسبی کوئی چیز نہیں سمجھی گئی۔ تیسرے: شرافت امہات کی جانب سے کوئی باوقعت نہیں۔ سارا مضمون اسی بنا پر ہے، جو نہایت منصفانہ اور محققانہ طور پر لکھا گیا۔

ہمارے مراسلہ نگار صاحب، خدا جانے، اس مضمون سے کیا سمجھ بیٹھے اور معلوم نہیں اپنے مضمون کی بنا کس سبجکٹ (Subject) پر قائم کی ہے۔ اگر مراسلہ نگار صاحب اس مضمون کے سمجھنے کی لیاقت نہیں رکھتے تھے، تو خواہ مخواہ کیوں خامہ فرسائی کی۔ بہتر ہوتا کہ پہلے اس مضمون کو کسی سے پڑھ کر سمجھ لیتے، اس کے بعد لکھنے بیٹھتے۔

ہمارے مضمون نگار صاحب نے کیا خوب مضمون لکھا ہے۔ پہلے تو آپ نے اپنا دل لعن طعن اور تشنیع سے ٹھنڈا کیا، اور اس پر اپنی محققانہ نظریوں دوڑائی کہ ''اڈیٹر دل گداز، علم حدیث اور اس کے متعلقات سے محض بے نصیب ہے اور طریقۂ استدلال سے محض ناآشنا''۔ اس مضمون غلط کی بنا چند امور پر ہے۔ اول: شرافت نسب کے معنی سے بے خبری۔ دوم: عرب کے تمامی قبائل کو یکساں سمجھنا۔ سوم: بغیر جانے معنی احادیث کے، بے صرفگی کرنا اور ان کو بے محل لانا۔ چہارم: حدیث موضوع سے تفسیر حدیث کرنا۔ پنجم: علم تطبیق احادیث سے بے نصیبی۔ ششم: ایسے امور سے استدلال جو قابل استدلال نہیں۔ ہفتم: جزئی سے کلی پر استدلال۔ ہشتم: شرافت نسب میں امہات کے شرف کو ضروری سمجھنا۔ بالکل باطل۔ جناب محترم مراسلہ نگار صاحب نے بڑی دھوم دھام سے نوٹ کیے، مگر ایک بات کو بھی ثابت نہیں کیا، اور کل باطل کا، اپنے زعم میں، حکم لگا دیا۔

اب دوسری بات یہ ارشاد ہوتی ہے کہ گبن کے خیال کا یہ منشا ہے کہ سادات کا گروہ کا زائد حضرت زین العابدین کی اولاد ہے، جو شہر بانو کے بطن سے تھی، غلط ہے۔ اس لیے کہ خاندان نبوت ہمیشہ سے اعلا ۴۱ اور اشرف چلا آیا ہے۔ یہ نہیں کہ اس کو زمانہ متاخر میں، یہ سب تعلق کے شرف ہوا ہو، بلکہ شرف اہل بیت منسوبہ ۴۲ بہ شرف نبوی ہے، اور یہ امر اصول موضوعہ کے طور پر ثابت ہو گیا ہے کہ نسب نبوی، اشرف اور افضل انساب ارض سے ہے۔

جناب محترم مراسلہ نگار صاحب! آپ ہم کو بتایئے کہ آپ نے اپنی اس تقریر سے کس مدعا کو ثابت کیا، اور جناب مولوی عبدالحلیم صاحب کے کس مضمون کی مخالفت کی ہے۔

میرے نزدیک (وہ) مضمون کا مفہوم ہی نہیں سمجھے، اور جس کو آپ نے لکھا، وہ بھی سمجھ کر نہیں لکھا۔ فتفہم۔

(باقی آئندہ)

(''ایڈیٹوریل نوٹس'' ص ۲ تا ۴۔ مئی ۱۸۹۳ء)

حواشی و تعلیقات

امداد صابری مرحوم، تاریخ صحافت اردو کی جلد اول کے دیباچے میں لکھتے ہیں ''میں نے ''تاریخ صحافت اردو'' مرتب کرنے کا ارادہ کیا۔ پانچ چھ سال کی کاشوں کے بعد اس میں مجھ کو کچھ تھوڑی بہت کامیابی حاصل ہوئی، جس کو میں پیش کر رہا ہوں''۔ (''تاریخ صحافت اردو''۔ جلد اول ص ۲۰) دیباچے پر یکم جنوری ۱۹۵۳ء کی تاریخ ہے۔ گویا ۱۹۵۲ء میں وہ پہلی جلد مکمل کر چکے تھے۔ پانچ چھ سال کے حساب سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں انہوں نے اس پر کام شروع کر دیا ہوگا۔ جب کہ اس تاریخ کی پانچویں جلد ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی۔ یوں تقریباً چھتیس سینتیس سال کا عرصہ ہوتا ہے جلد اول پر کام کے آغاز اور آخری جلد کی اشاعت تک۔

''روح صحافت''۔ ص ۲۷۵

بشیر حسین ضیائی ایم اے (علیگ) ۲۳ جنوری ۱۸۹۸ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ مرے کالج سیالکوٹ سے گریجوایشن اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایم اے کیا۔ محکمہ تعلیم سے منسلک ہوئے۔ ۱۹۵۴ء میں شعبہ تعلیم کے ڈائریکٹوریٹ سے بہ حیثیت پلاننگ آفیسر ڈویلپمنٹ ریٹائر ہوئے۔ لاہور میں ۱۲ اگست ۱۹۸۰ء کو انتقال کیا۔ (''گزرگاہ خیال''۔ ص ۹۔۱۰)

ضیائی صاحب شاعر اور مترجم بھی تھے۔ ان کا مجموعہ کلام ''گزرگاہ خیال'' کے عنوان سے جولائی 1998ء میں شائع ہوا۔ کچھ انگریزی ناولوں کے تراجم بھی انہوں نے کیے جو شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا کلام اختر شیرانی کے رسالے ''رومان'' میں قبل تقسیم شائع ہوتا تھا۔ اردو شعرا کا ایک ضخیم ترین تذکرہ مرتب کیا جو تیس سے زائد جلدوں پر مشتمل اور ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ ان کے بڑے بھائی امیر حسن ناز اپنے زمانے کی معروف ادبی شخصیت تھے۔ وہ خود بھی صاحب ذوق ادیب تھے۔ ان کا کتب خانہ نادر کتب و رسائل کا مخزن تھا جو انہوں نے نہایت نفاست اور حفاظت کے ساتھ منظم کر رکھا تھا۔ کئی اہل علم ان کے اس نادر اور منفرد کتب خانے سے استفادہ کر چکے ہیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کے کتب خانے کا بڑا حصہ آفات زمانہ کی نذر ہو گیا۔ باقی ماندہ کتاب خانے کو ترتیب دلا کر ان کے بڑے صاحبزادے کرنل (ریٹائرڈ) نسیم احمد نے اقبال اکادمی، لاہور کے کتب خانے میں محفوظ کرا دیا ہے۔ اس ذخیرے کو ''ذخیرہ ضیائی'' کا نام دیا گیا ہے۔ اس ذخیرے کی فہرست عن قریب شائع ہوگی۔

تاریخ ادب اردو۔ حصہ نثر۔ ص ۱۳۳۔ نیز سہ ماہی ''اردو''۔ اپریل ۱۹۸۱ء۔ ص ۱۲۷

سہ ماہی ''اردو''۔ اپریل ۱۹۸۱ء۔ ص ۱۲۲

ایضاً۔ ص ۱۲۴

۷۔ تاریخ ادب اردو۔ حصہ نثر ص ۱۳۳۔ شرر کے حالات اردو ترجمہ تاریخ میں خود شرر کے مہیا کردہ ہیں، عسکری نے سکسینہ کی انگریزی عبارت کا ترجمہ نہیں کیا، اس لیے سکسینہ کے بجائے عسکری کا حوالہ دیا گیا ہے۔

۸۔ ایضاً ۹۔ سہ ماہی ''اردو'' اپریل ۱۹۸۱ء ص ۱۲۳

۱۰۔ اصل: کارروائی۔ تمام اندراجات میں سوائے آخری دو کے۔

۱۱۔ جون کے شمارے میں نام ''علی جان'' جولائی کے شمارے میں ''علیجان'' اور اگست میں ''علی جان'' ہے۔ ''علی جان'' ہی درست لگتا ہے۔

۱۲۔	ایک جز، ۱۶ صفحات کا ہوتا ہے۔	۱۳	اصل: سئے	۱۴	اصل: اعلی
۱۵	اصل: کتاب	۱۶	ایک روپیہ	۱۷	غالباً عادات
۱۸	سوا روپیا	۱۹	ڈیڑھ روپیا	۲۰	دو روپے
۲۱	چار روپے	۲۲	تین روپے	۲۳	اصل: اعلی
۲۴	یعنی ''فل اسکیپ	۲۵	اصل: اعلے	۲۶	پانچ روپے
۲۷	پندرہ روپے	۲۸	اصل: ہیں	۲۹	اصل: اعلے
۳۰	اصل میں ۱۵ کا ہندسہ تھا	۳۱	یعنی پچاس جلدیں یک مشت خریدنے پر۔		
۳۲	ویلیو پے ایبل (V.P.P)	۳۳	غالباً لکھنو	۳۴	اصل: کے
۳۵	اصل: شکرگزار	۳۶	اصل عبارت میں یہاں ۲۹ کا ہندسہ تھا۔		
۳۷	اضافہ از مضمون نگار	۳۸، ۳۹	اصل عبارت میں ۲ کا ہندسہ تھا۔		
۴۰	اصل: طلنیق	۴۱	اصل: اعلی	۴۲	اصل: منسو:

مآخذ

امداد صابری

۱۔ تاریخ صحافت اردو۔ جلد اول۔ اشاعت اول۔ دہلی، ۱۹۵۳ء

۲۔ ایضاً، جلد پنجم۔ اشاعت اول۔ دہلی، ۱۹۸۳ء

۳۔ روح صحافت۔ اشاعت اول۔ دہلی، مکتبہ شاہراہ، ۱۹۶۸ء

حسن شاہ، سید

ماہنامہ ''اتحاد'' لکھنو۔ جون، جولائی، اگست، ستمبر، نومبر ۱۸۹۲ء، مئی ۱۸۹۳ء

سکسینہ، رام بابو

تاریخ ادب اردو (مترجم مرزا محمد عسکری۔ مقدمہ: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار) لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز۔ (س۔ن)

شفقت رضوی

مولانا شرر کی صحافت۔ سہ ماہی ''اردو''۔ کراچی، اپریل تا جون ۱۹۸۱ء۔ ص ص ۱۰۳ تا ۱۲۲۔

ضیائی، بشیر حسین

گزرگاہ خیال (مرتب: ڈاکٹر سید ریاض احمد) اسلام آباد، دارالاشاعت بزم علم و فن پاکستان، اشاعت اول، جولائی ۱۹۹۸ء

آثار الاولیاء

محمد عالم مختار حق

راقم الحروف کے دل پسند مشاغل میں سے ایک مشغلہ اصحاب فضل و کمال پر لکھے گئے تذکروں کی اپنے ذاتی ذخیرۂ کتب کے لیے گرد آوری اور مطالعہ ہے۔ اس سلسلے کی ایک ضخیم و فخیم کتاب ''آثار الاولیاء'' پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کلیہ علوم اسلامیہ شرقیہ کی مسند علی ہجویری (بعض حضرات اپنے مخصوص نظریات کی بنا پر ان کا زبان زد لقب داتا گنج بخش لکھنے اور بولنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں) کے زیر اہتمام منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہوئی ہے۔ آثار الاولیاء کی ترتیب و تدوین جناب پروفیسر سید محمد اکرم اکرام صاحب کی رہین منت ہے جنہوں نے اپنی زیر نگرانی تین طالبات (شمیم فردوس، بلقیس اختر اور شاہدہ پروین) کو آثار کی تدوین کا کام سونپا اور اس کی تکمیل کے لیے ایک محققہ محترمہ انجم طاہرہ صاحبہ کی خدمات مستعار لی گئیں تب کہیں جا کر جو کام ۱۹۸۴ء میں شروع ہوا تھا ایک طویل اور صبر آزما مرحلے کے بعد ۲۰۰۰ء میں کتابی صورت میں نقش پذیر ہو سکا۔ اس کتاب میں سیکڑوں رسائل، جرائد، مخطوطات، سیرت و سوانح اور تذکار کی ورق گردانی کے بعد برصغیر پاک و ہند سے وابستہ اولیاء کرام اور مشائخ عظام کے احوال و آثار پر مرقوم کتب و رسائل کو منضبط کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے اہل تحقیق کے لیے یہ کتاب ایک رہنما کا فریضہ انجام دے گی اور کسی مطلوبہ شخصیت پر کام کرنے کے سلسلے میں ان کے لیے اس سے استفادہ ناگزیر ہوگا۔ اس حوالہ سے یہ کام قابل قدر اور لائق صد تحسین و آفرین ہے۔

اردو میں اس قسم کی حوالجاتی کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس قسم کا ایک نہایت مفید اور کارآمد سلسلہ ''ماخذات۔ احوال شعراء و مشاہیر'' کے عنوان سے سرفراز علی رضوی صاحب نے شروع کیا تھا جس کی طباعت کا بیڑا انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی نے اٹھایا تھا مگر افسوس یہ سلسلہ ان کے سانحۂ ارتحال کے سبب دو جلدوں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ جو لفظ ''اس'' تک منتہی ہوتا ہے۔ ''ماخذات'' میں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس میں ممکنہ حد تک ہر شخصیت کی ابتدا میں اس کا مختصر تعارفی خاکہ دیا گیا ہے۔ کاش یہی معاملہ ''آثار'' کے ساتھ بھی روا رکھا جاتا تو اس کی قدر و قیمت میں وہ چند اضافہ ہو جاتا۔ خیر یہ تو تھا جملۂ معترضہ۔ آمدم برسر مطلب۔

راقم کے مزاج میں شروع ہی سے یہ عادت راسخ ہو چکی ہے کہ ہر نئی کتاب کی پہلے تمہید کا مطالعہ کرتا ہے بعد ازاں کتاب کی ثقاہت پرکھنے کے لیے نظر مآخذ پر جا ٹکتی ہے۔ یہی معاملہ ''آثار'' کے ساتھ پیش آیا۔ تمہیدی کلمات (تعارف) میں کتاب کے مرتب جناب اکرم صاحب نے داستان ترتیب بیان کی ہے جس میں ضمناً برصغیر پاک و ہند کی تاریخ تصوف پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اگرچہ یہ موضوع ''من از ذوق حضوری طول دادم داستانے را'' کا متقاضی تھا مگر انہوں نے ''حکایت بود بے پایاں و لیکن

خضر الرومیؒ کی آسان راہ کو ترجیح دی۔ تعارف کے مطالعہ سے جی خوش ہو گیا اور زبان پر بے اختیار ماشاء اللہ، جزاک اللہ کے دعائیہ کلمات جاری ہو گئے۔ اور یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ کتابیات کی کمپوزنگ میں لاپروائی سے کام لیا گیا ہے اور کتابت خوانی پر مطلق توجہ نہیں دی گئی۔ بلکہ یہ کام آہنی کاتب (کمپوزر) کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ انا للہ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فہرست میں کمپوزنگ کی ان گنت غلطیاں در آئی ہیں جن کی درستی ایک الگ صحت نامہ کی متقاضی ہوئی۔ یہ کام ہم نے اپنی بساط کے مطابق اعزازی طور پر انجام دے دیا ہے اور یہ صحت نامہ مضمون ہذا کے آخر میں ملحق کر دیا ہے تاکہ جن اصحاب کے پاس آثار کا زیر بحث نسخہ موجود ہے، وہ اس صحت نامہ کی مدد سے اپنے نسخے درست کر لیں۔

مطالعۂ آثار کے دوران اس بات کا احساس ہوا کہ کتاب پر نظر ثانی نہیں کی گئی۔ بیبیوں نے اپنے طالبانہ معیار کے مطابق جیسا تیسا کر کے یہ کام نبیڑ دیا اور ادارے نے جوں کا توں چھاپے پر چڑھا دیا۔ نتیجۃً اس میں ہر قسم کی بے احتیاطی راہ پا گئی۔

۱۔ص ۵ ابراہیم، سید بن نور الدین (متوفی ۱۳۴۰ھ)

شریف التواریخ جلد دوم حصہ اول ص ۸۴۵ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ مذکورہ کتاب میں موصوف کے حالات میں مرقوم ہے کہ ''آپ کی بیعت طریقت شیخ غلام حسین موتیانوالہ سے تھی''۔ اس سلسلے میں گزارش ہے کہ صرف کسی پیر طریقت کا مرید ہو جانا اس بات کو مستلزم نہیں کہ اس مرید کا نام زمرہ اولیاء میں درج ہو گیا ہے جب تک کہ اسے خلافت اور اجازت بیعت سے نہ نوازا جائے۔ یہی معاملہ نیاز احمد بن الہ بخش سائیں (ص ۶۱۸) کا ہے جنہیں مرید سید شریف احمد شریف (درست شرافت) نوشاہی کا لکھا گیا ہے۔ مرید ہونے کا ذکر ہے نہ کہ خلیفہ مجاز ہونے کا۔ آثار میں اس کتاب کے کثیر حوالے درج ہیں ان سب کا جائزہ لیا جائے تو اس قسم کے ''اولیاء'' کی اور بہت سی مثالیں سامنے آ سکتی ہیں۔ یاد رہے کہ شریف التواریخ متوسط ضخامت کی پندرہ جلدوں پر مشتمل ہے جس میں نوشاہیت کی تاریخ کے علاوہ نوشاہی اکابرین، خلفاء، متوسلین اور مریدین کے حالات و مقامات درج ہیں۔ یہ کتاب نوشاہیت کا دائرہ معارف کہلانے کی مستحق ہے۔ طریقت کے دیگر سلاسل ایسی معلومات افزا کتاب سے میرے علم کی حد تک تہی دامن ہیں البتہ اس میں درج ہر شخصیت کو مسند خلافت پر متمکن کر دینا درست نہ ہوگا۔

۲۔ص ۸ ابوالحسن علی الحسن ندوی، مولانا (۵۸۱۔۶۷۷ھ) مدفون مانک پور

پہلی بات تو یہ ہے کہ درست نام علی الحسنی ہے نہ کہ علی الحسن۔ آپ برصغیر پاک و ہند کے مشہور عالم دین، مصنف اور مفکر ہیں۔ ان کا انتقال ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کو رائے بریلی (اتر پردیش بھارت) میں ہوا اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔ نام کے ساتھ جو سنین ولادت و وفات تحریر ہیں یہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے جد اعلیٰ کبیر الشیخ سید محمد قطب الدین المغربی سے متعلق ہیں جو ساتویں صدی ہجری کے نصف اول میں اپنے رفقاء کے ساتھ بغداد سے براہ غزنی ہندوستان تشریف لائے تھے اور وہیں مانک پور میں دفن ہیں۔ احوال العارفین میں، جہاں سے یہ حوالہ نقل کیا گیا ہے مولانا ابوالحسن علی ندوی کو ''مدظلہٗ'' لکھا ہے۔ نقل کرنے والے غالباً مدظلہ کے مفہوم سے ناآشنا معلوم ہوتے ہیں ورنہ وہ انہیں ۶۷۷ ہجری میں وفات یافتہ قرار نہ دیتے۔ جب کہ وہ دونوں کتابوں آثار الاولیاء اور احوال العارفین کی تصنیف کے دوران بقید حیات تھے۔ کچھ اسی قسم کا سلوک خان محمد خواجہ (ص ۱۵۷) کے ساتھ کیا ہے۔ ن کے نام کے ساتھ مدظلہ العالی بھی لکھا ہے اور ساتھ ہی ۱۳۷۹ ہجری میں انہیں پیوند خاک بھی کر رکھا ہے۔

۳۔ بعض علماء کرام کے نام دو دو مرتبہ، ایک مرتبہ نام کی ترتیب سے جب کہ دوسری مرتبہ ان کی کنیت کے حوالے سے درج کیے گئے ہیں جیسے کہ احمد رضا قادری بریلوی (ص ۲۳) اور پھر فاضل بریلوی (ص ۳۹۲) ظفر الدین بہاری متوفی ۱۳۸۲ھ (ص ۲۷۵) اور پھر دوسری مرتبہ اس سے متصل ظفر الدین قادری متوفی ۱۳۹۲ھ درست ۱۳۸۲ھ ہے۔ ۱۳۹۲ھ غلط ہے حالانکہ جس کتاب ''حیات ملک العلماء'' کا حوالہ دیا ہے اس میں درست سال وفات ۱۳۸۲ھ ہی درج ہے۔

محمد قاسم حجۃ الاسلام، مولانا بانی (ص ۵۲۴) پھر محمد قاسم نانوتوی (ص ۵۲۵)۔ ''مولانا بانی'' کے بعد کے الفاظ ''دارالعلوم دیوبند'' محذوف ہیں۔

۴۔ص ۴۱ اسمٰعیل پانی پتی، شیخ

شیخ اسماعیل پانی پتی مشہور مرزائی عالم تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسلمان اولیاء کی فہرست میں ان کا نام شامل کیا جا سکتا ہے؟

۵۔ص ۶۰ انور حسین نفیس الحسینی (ت ۱۳۵۱ھ)

الحمد للہ آپ بقید حیات ہیں۔ آپ پاکستان کے نامور خوشنویس اور مولانا عبدالقادر رائے پوری کے خلیفہ مجاز ہیں۔ اور اپنے حلقہ میں نہایت عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ راقم الحروف پر بھی شفقت فرماتے رہتے ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود چونکہ نفیس صاحب (خدا انہیں سلامت با کرامت رکھے) گزشتگان کے زمرہ میں شامل نہیں۔ لہذا انہیں اس مجموعے میں اصولاً شامل نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہی معاملہ میاں زبیر احمد صاحب ضیائی بن میاں بدر الدین (ص ۱۹۹) زیب سجادہ آستانہ عالیہ داتا گنج بخش اور پیر نور محمد نصرت نوشاہی (ص ۶۱۷) زیب سجادہ میاں ہرنی شاہ رحمۃ اللہ شرقپور شریف کے ساتھ روا رکھا گیا ہے۔ یہ حضرات بھی سلامت با کرامت ہیں اور راقم الحروف پر مہربان۔ اگر ان پیروں کا ذکر خیر عمداً اس تذکرہ میں محفوظ کیا گیا ہے تو پھر دیگر سجادگان کرام، پیران طریقت و مشائخ عظام کی جو ایک فوج ملک میں موجود ہے، اسے کیوں مرفوع القلم سمجھا گیا۔ جب کہ بعض کا علم ہوتے ہوئے بھی انہیں خفتگان خاک میں شامل کیا گیا ہے جیسے: محمد دین بقید حیات (ص ۴۷۱)، محمد یحیٰی بہاولنگری بقید حیات (ص ۵۴۳)، واحد بخش سیال ربانی، الحاج زندہ (ص ۶۱۹)

۶۔ص ۶۷ برکت علی شاہ (م ۱۳۴۵ھ)

ماخذ میں اذکار جمیل کا حوالہ غلط دیا گیا ہے۔ یہ کتاب برکت علی شاہ خلچیانوی (امرتسری) کے حالات پر مشتمل ہے جو ۳۰ رمضان ۱۳۵۹ھ کو واصل بحق ہوئے جب کہ آثار والے برکت علی شاہ کا تعلق اولیائے بنگالہ سے ہے اور وہ ۱۳۴۵ھ میں واصل بحق ہوئے۔

۷۔ص ۲۰۰ زیب النساء المعروف دائی انگہ

یہ شاہجہان بادشاہ کی مرضعہ تھی جسے ایک غیر مستند کتاب (مدینۃ الاولیاء) کے حوالے سے ولیہ بنا دیا گیا ہے۔ کسی قبر پر مزار کا بن جانا اس بات کی علامت نہیں کہ صاحب مزار ولی اللہ بھی ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں امراء، وزراء، اور بادشاہوں کے متعدد مزارات موجود ہیں مگر ہم انہیں اولیاء کرام کے زمرہ میں شامل نہیں کرتے۔ یہی حال دائی انگہ کا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۸۔ص ۴۰۱ ٹبہ بابا فرید (۱۱۸۸ھ۔۱۲۶۷ھ)

ٹبہ بلند مقام یا ٹیلہ کو کہتے ہیں یہ کسی بزرگ کا نام نہیں ہے بلکہ بابا فرید گنج شکرؒ نے چلہ کشی کے لیے یہ مقام منتخب فرمایا تھا اور یہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ آپ روزانہ حضرت داتا گنج بخش کے آستانہ عالیہ پر حاضری دیتے اور شب بسری اس ٹبہ پر کرتے۔ اب اس چلہ کشی کی جگہ پر ایک حجرہ موجود ہے۔ یہ چلہ گاہ ضلع کچہری اور سینئر سپرنٹنڈنٹ آف پولیس کے دفاتر کے درمیان واقع ہے۔ تعجب ہے کہ مرتبین نے ایک ٹبہ کو ولی اللہ کا درجہ کیسے دے دیا۔ اور پھر اس بزرگ کے سنین ولادت و وصال بھی لکھ دیئے۔ سنین مذکور حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی حیات سے متعلق ہیں اور یہ سنین بھی ہجری نہیں بلکہ عیسوی ہیں۔

۹۔ص ۴۶۹۔محمد اقبال لاہوری، علامہ (متوفی ۱۹۳۸ء) مدفن لاہور

صرف دو مآخذ کی نشاندہی کی گئی ہے یعنی مدینۃ الاولیاء اور زندہ رود۔ مدینۃ الاولیاء ایک متاخر، غیر معروف اور غیر مستند اولیائے لاہور کا تذکرہ ہے اور کبھی کسی ''اقبالی'' نے اسے درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ رہ گئی زندہ رود تو یہ بے شک ان کے ہونہار بیٹے ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کی تصنیف اور ایک مستند ماخذ کی حیثیت سے قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے مگر یہ تصنیف بھی ۱۹۷۹ء میں یعنی وفات اقبال (۱۹۳۸ء) کے ۴۱ برس بعد وجود پذیر ہوئی۔ اقبال پر یوں تو ان کے سانحہ رحلت کے بعد سے مسلسل لکھا جا رہا ہے بلکہ ملک میں دو ادارے بزم اقبال اور اقبال اکیڈمی علامہ کی حیات، شاعری اور فکر پر مستقل طور پر کتابیں اور رسالے شائع کر رہے ہیں۔ دیگر پرائیویٹ ادارے بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق علامہ پر کام کر رہے ہیں۔ اس سب کے احاطہ کے لیے تو کئی دفتر درکار ہوتے اس لیے بہتر ہوتا کہ علامہ پر لکھی گئیں چند متقدم کتب کا حوالہ دیا جاتا جیسے:

۱۔اقبال از مولوی احمد دین (علامہ کی عین حیات طبع ہوئی) ۱۹۲۳ء (طبع دوم ۱۹۲۶ء، تحقیق مشفق خواجہ صاحب)

۲۔سیرت اقبال، محمد طاہر فاروقی، ۱۹۳۹ء

۳۔اقبال کامل از عبدالسلام ندوی، ۱۹۴۸ء

۴۔روزگار فقیر از فقیر سید وحیدالدین، ۱۹۵۰ء

۵۔ذکر اقبال از عبدالمجید سالک، ۱۹۵۵ء

دوسری گزارش یہ کہ اس میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں کہ علامہ اقبال بہت بڑے مفکر تھے۔ ترجمان حقیقت تھے، شاعر مشرق تھے۔ حکیم الامت تھے بلکہ ملک الشعراء مولانا غلام قادر گرامی (متوفی ۲۷۔۵۔۲۶) شاعر خاص حضور نظام دکن تو ان کے متعلق یہاں تک کہہ گئے کہ:

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

مگر ان سب اوصاف و اعزازات کے باوصف انہیں کبھی کسی نے اولیاء اللہ کے زمرے میں شمار نہیں کیا۔

۱۰۔ص ۴۸۹۔محمد حسین نقشبندی، حاجی میاں

آپ کے ماخذ میں دیگر مآخذ کے علاوہ نزہۃ الخواطر جلد نمبر ۸ کے ص ۴۲۲ کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ موصوف سے راقم کا

تعلق چونکہ باپ بیٹے کا ہے اور راقم کو والد مرحوم و مغفور کے حالات کے مآخذ کا ذاتی طور پر علم ہے۔ لہٰذا جب مذکورہ حوالے کی طرف رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ نزہۃ الخواطر والے صاحب سید محمد حسین نصیر آبادی ہیں نہ کہ الحاج میاں محمد حسین نقشبندی۔ میاں صاحب مرحوم کے حالات پر راقم نے جو کتابچہ بعنوان ''نقوش جمیل'' تالیف کیا تھا، اس کا ذکر تک نہیں۔

۱۱۔ پیش لفظ میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ ''اس کتاب میں برصغیر کی ہزار سالہ تاریخ تصوف سے متعلق اولیاء و مشائخ کے احوال و آثار پر مرقوم کتب و رسائل کو منضبط کیا گیا ہے'' اس دعویٰ کے برعکس کتاب میں دیگر ممالک میں مدفون بعض مشہور اولیائے کرام کو بھی معلومات کی کوتاہ دامنی کے سبب برصغیر پاک و ہند میں مدفون اولیاء کرام کے زمرے میں شامل کر لیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ص ۲۵۳ شہاب الدین عمر سہروردی۔ مدفن دہلی

آپ تصوف کے مشہور سلسلہ سہروردیہ کے بانی ہیں۔ آپ کا مدفن دہلی نہیں بلکہ بغداد ہے۔

۲۔ص ۳۸۳ غوث الاعظم دستگیر کو بھی برصغیر میں لا بٹھایا ہے۔ بھلا آپ کے مدفن بغداد سے کون سا عقیدت مند ناواقف ہے۔

۳۔ص ۳۹۹ فخر الدین عراقی، شیخ

ان کا مزار دمشق میں ہے مگر ان کا شمول بھی کتاب میں ضروری سمجھا گیا ہے۔

۴۔ص ۴۸۳ محمد پارسا نقشبندی بخاری (متوفی ۷۵۶ھ)

آپ بخارا کے رہنے والے تھے۔ سفر حرمین الشریفین کے دوران مدینہ منورہ میں ۸۲۲ھ کو انتقال کیا اور امیر المؤمنین حضرت عباس کے قبہ شریف کے پاس جنت البقیع میں آسودۂ خاک ہوئے۔ تاریخ وفات ۷۵۶ھ بھی غلط درج کی گئی ہے۔

۵۔ص ۵۶۲ مظفر بن شمس الدین بلخی

آپ شرف الدین یحییٰ منیری کے مرید تھے۔ بہار سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے۔ وہاں سے پانچ سال کے بعد عدن گئے جہاں ان کا انتقال ہو گیا۔

۶۔ص ۵۹۰ نجم الدین کبریٰ، شیخ (متوفی ۱۱۴۱ھ) مدفون پرگنہ دھلو

آپ کبرویہ سلسلۂ تصوف کے بانی ہیں۔ آپ نے ۶۱۸ھ (نہ کہ ۱۱۴۱ھ) میں بہ زمانہ سلطان محمد خوارزم شاہ، بلاکو خان کی فوج کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا اور خوارزم ہی میں ان کی آخری آرام گاہ بنی۔ حوالہ میں مرآۃ الاسرار (ترجمہ) کے ص ۵۴ کا حوالہ دیا گیا ہے جب کہ موصوف کے حالات ص ۶۱۳ پر دیے گئے ہیں۔

۱۲۔ بعض شخصیات کے اسماء کی ابتدا میں ''ال'' کا بے جا اضافہ کیا گیا ہے جیسے فضل رحمٰن گنج مراد آبادی کو فضل الرحمٰن (ص ۴۰۷) بنایا گیا ہے جب کہ فضل رحمٰن تاریخی نام ہے جس سے موصوف کا سنہ ولادت ۱۲۰۸ھ مستخرج ہوتا ہے اور ''ال'' کے اضافہ سے سال ولادت میں ۳۱ سال کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

اسی طرح شیخ الہند مولانا محمود حسن کے نام کی ابتدا میں بھی ''ال'' کا اضافہ کر کے اسے محمود الحسن دیوبندی (ص ۵۴۷) اور سید احمد شہید کو سید احمد الشہید (ص ۶۷۶، ۱۰۳۴) بنا دیا گیا ہے۔ ان اسماء میں ''ال'' کا اضافہ نامناسب ہے۔ کتابیات سے متعلق صحت نامہ تو ہم آخر میں ملحق کریں گے البتہ سردست اس فہرست میں پائے جانے والے بعض علمی تسامحات کی طرف قارئین کرام

کی توجہ منعطف کی جارہی ہے۔حوالے کے لیے کتاب کا شمارہ نمبر ساتھ دیا جارہا ہے۔

۱۳۔ بعض کتب میں سے اسم کی نشانی (ال) بلاوجہ ساقط کردی گئی ہے جیسے:

ا:ص ۶۴۵ (نمبر ۱۵) محمد ابوالشرف کی جگہ ابوشرف محمد

ب:ص ۶۷۳ (نمبر ۹۴۲) سکینۃ الاولیاء کی جگہ سکینۃ اولیاء

ج:ص ۶۸۹ (نمبر ۱۴۰۴) مدینۃ الاولیاء کی جگہ مدینۃ اولیاء

۱۴۔ ص ۶۴۵ (نمبر ۵) سرسید احمد خان کی شہرہ آفاق تصنیف ''آثار الصنادید'' کو خلیق انجم صاحب نے تین جلدوں میں مرتب کیا تھا۔ جسے بلاتحقیق ناموں میں لفظ خلیق کے باہمی اشتراک کے سبب خلیق احمد نظامی کے کھاتے میں ڈال دیا گیا ہے۔

۱۵۔ ص ۶۴۸ (نمبر ۱۱۷) افضل المطابع المعروف بڑی سوانح عمری حافظ اللہ دہلی

یہ اندراج ہی غلط ہے۔ظاہر ہے افضل المطابع کسی کتاب کا نام نہیں بلکہ پریس کا نام ہے۔یہ دراصل تاریخ اجمیر شریف ہے جو مع بڑی سوانح عمری رحمانی پریس دہلی سے چھپی اور اس کے مصنف کا نام حافظ محمد خلیل حسین دہلوی ہے نہ کہ حافظ اللہ۔

۱۶۔ ص ۶۴۸ (نمبر ۱۲۵) اکابر تحریک پاکستان علامہ نور بخش۔گجرات ۱۹۷۶ء

یہ محمد صادق قصوری کی تصنیف ہے جسے علامہ نور بخش کے کھاتے میں ڈال دیا گیا ہے جب کہ تذکرہ مشائخ نقشبندیہ مصنفہ علامہ نور بخش توکلی کو محمد صادق قصوری کے کھاتے میں ڈال کر حساب برابر کردیا گیا ہے۔(ص ۶۶۱ نمبر ۵۷۱)

۱۷۔ ص ۶۶۵ (نمبر ۶۶۹) حسین شہید سہروردی۔اشرف علی تھانوی لاہور ۱۹۶۴ء

حسین شہید سہروردی کا انتقال ۵ دسمبر ۱۹۶۳ء کو ہوا جب کہ مولانا تھانوی ۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء کو (کم وبیش بیس برس پیشتر) وفات پاچکے تھے۔لہٰذا ان حالات میں ان کا ایک سیاسی رہنما کی سوانح عمری لکھنا بعید از قیاس ہے اور نہ ہی تھانوی صاحب کے کسی سوانح نگار نے ذکر کیا۔اگرچہ علماء کے لیے سیاستدانوں کے حالات لکھنا شجر ممنوعہ نہیں تاہم ان کی شان کے شایان بھی نہیں۔آخر امیر جماعت اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے بھی تو مہاتما گاندھی اور مشہور ہندو مہاسبھائی لیڈر آنریبل پنڈت مدن موہن مالویہ کے حالات زندگی قلم بند کیے تھے۔اس سے مولانا کی عظمت کا چاند تو گہنا نہیں گیا۔آخر الذکر کتاب دفتر تاج جبلپور سے ۱۹۱۹ میں شائع ہوئی تھی جس کا عکس خدا بخش لائبریری پٹنہ کے سہ ماہی جرنل نمبر ۵۰ برائے ۱۹۸۹ء میں چھپ چکا ہے۔

۱۸۔ ص ۶۹۵ (نمبر ۱۵۹۹/۱۶۰۶) نزہۃ الخواطر۔بہجۃ السامع والنواظر۔عبدالحئی بریلوی۔مترجم ابویحییٰ امام خان لاہور ۱۹۶۵ء

کتاب کا درست نام نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر ہے۔یہ کتاب عربی میں آٹھ جلدوں میں علماء واعیان پاک وہند کے مبسوط تراجم پر مشتمل ہے۔اس کے مصنف کا نام علامہ عبدالحی بن فخر الدین حسنی ندوی ہے نہ کہ بریلوی۔ان آٹھ جلدوں میں سے ابتدائی چار جلدوں کا اردو ترجمہ مولانا ابویحییٰ امام خان نوشہروی نے کیا تھا جسے مقبول اکادمی لاہور نے باعانت محکمہ اوقاف مغربی پاکستان ۱۹۶۵ء میں چھاپ دیا تھا جب کہ فہرست میں آٹھوں جلدوں کے اردو ترجمہ کا ذکر ہے اور لطف یہ کہ جن جلدوں کے ترجمے نہیں ہوئے ان کے حوالے بھی کتاب کے متن میں جابجا موجود ہیں۔ملاحظہ ہو ص ۷، ۸، وغیرہ۔

۱۹۔ ص ۷۰۶ (نمبر ۱۸۹۲) عوارف المعارف۔شمس بریلوی۔مصر ۱۳۰۳ھ

گزارش ہے کہ عوارف المعارف شیخ الشیوخ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی تصنیف ہے نہ کہ شمس بریلوی کی۔ البتہ شمس بریلوی نے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جو مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی کی طرف سے ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا نہ کہ مصر سے ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۵ء) میں۔

۲۰۔ فہرست کتابیات میں بعض بزرگان کرام کے اسماء عامیانہ انداز میں تحریر کیے گئے ہیں اور ان کے حفظ مراتب کا خیال نہیں رکھا گیا۔اور جو نام ان کے بنائے شہرت ہیں انہیں نظر انداز کردیا گیا ہے۔

بعض مثالیں ملاحظہ ہوں۔درست نام خطوط وحدانی میں تحریر کردیے گئے ہیں۔

نمبر ۱۳۶: الدر المنظوم فی ترجمہ ملفوظ المخدوم۔ملفوظات جلال الدین (جلال الدین معروف بہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت۔نیز درست لفظ ملفوظ ہے نہ کہ ملفوض)

نمبر ۱۸۶: انفاس رحیمیہ۔اردو مکتوبات۔عبدالرحیم (شاہ عبدالرحیم محدث دہلوی۔نیز مکتوبات اردو میں نہیں بلکہ فارسی میں ہیں)

نمبر ۲۸۰: بیاض یعقوبی۔یعقوب نانوتوی (مولانا محمد یعقوب نانوتوی)

نمبر ۴۲۶: تذکرۂ اسلاف۔مولانا قاسمی (مولانا بہاء الحق قاسمی والد گرامی معروف کالم نگار جناب عطاء الحق قاسمی)

نمبر ۶۳۰: جواہر معصومیہ۔سوانح معصوم (خواجہ محمد معصوم خلف حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی)

نمبر ۱۶۱۵: نفحات الانس۔عبدالرحمٰن (مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامی)

۲۱۔ ذیل میں ان کتابوں کے نام درج کیے جارہے ہیں جو عرفی ناموں سے چھپی ہیں۔بہتر ہوتا اگر خطوط وحدانی میں اس شخصیت کے نام کی تشخیص کردی جاتی جس کے حالات پر وہ کتاب مشتمل ہے تاکہ تحقیقی کام کرنے والے اس سے استفادہ کرسکتے۔ ہم نے اپنی دانست کے مطابق ان عرفی اسماء میں مذکور شخصیات کے نام خطوط وحدانی میں تحریر کردیے ہیں۔

نمبر ۷۰۴: حضرت شیخ القرآن۔منظور احمد خاں (مولانا عبدالغفور چشتی ہزاروی)

نمبر ۷۳۳: حیات استاد العلماء۔عطا محمد (لطف اللہ اعظم گڑھی)

نمبر ۷۵۵: حیات طیبہ۔میرزا حیرت دہلوی (شاہ اسمٰعیل شہید)

نمبر ۷۶۷: حیات ملک العلماء۔مختار الدین احمد (مولانا ظفر الدین بہاری)

نمبر ۸۰۵: خلیفۂ اعظم۔شریف احمد شرافت نوشاہی (حافظ محمد برخوردار)

نمبر ۸۵۹: ذکر کرام۔حفیظ الرحمٰن حفیظ بہاول پوری۔(ریاست بہاول پور کے دوسو سے زائد مزارات، خانقاہوں اور بزرگوں کے حالات)

۲۲۔ بعض کتابیں دو دو مرتبہ درج کی گئی ہیں۔ایک مرتبہ مکمل نام کے ساتھ اور دوسری مرتبہ اس کا ابتدائی لفظ حذف کرکے جیسے:

نمبر ۱۹۶: انوار الکریم (اولیائے نقشبند۔انیس احمد شیخ)

نمبر ۲۲۰: انیس الطالبین المعروف بہ انوار الکریم۔انیس احمد شیخ نقشبندی

نمبر۵۰۴: تذکرہ ریاض العارفین۔ رضا قلی خاں ہدایت نمبر۹۵۴۔۹۰۰: ریاض العارفین

نمبر۵۶۵: تذکرہ مشائخ بھر چونڈی شریف نمبر۱۱۴۵: عبادالرحمٰن تذکرہ مشائخ بھر چونڈی شریف

نمبر۱۹۵۵: تذکرہ ریاض العارفین۔ آفتاب رائے لکھنوی نمبر۹۰۱: ریاض العارفین

۲۳۔ بعض کتابیں مصنفین کے بجائے ان کتابوں کے مترجمین یا مرتبین کے کھاتے میں ڈال دی گئی ہیں۔ خطوط وحدانی میں ہم نے درست نام دے دیے ہیں۔ جیسے:

نمبر۶۶۴: حسنات الحرمین۔ محمد اقبال مجددی (مصنف: ملا شاکر بن بدرالدین۔ مترجم: محمد اقبال مجددی)

نمبر۱۴۵۵: معراج العاشقین۔ گوپی چند نارنگ (مصنف: سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز، مرتب: گوپی چند نارنگ)

نمبر۱۴۶۹: مقابس المجالس۔ کپتان واحد بخش سیال (مصنف: مولانا رکن الدین۔ مترجم: کپتان واحد بخش سیال۔ کتاب کا درست نام مقابیس المجالس ہے)

۲۴۔ بعض کتب معمولی تغیر کے بعد دو دو جگہ درج کی گئی ہیں حالانکہ ان کا ایک دفعہ ذکر ہی ہونا چاہیے تھا۔ مراد تو مآخذ کی نشاندہی کرنا ہے نہ کہ تعداد میں اضافہ۔ مثلاً:

نمبر۶۷: ارشادات مجدد۔ جمیل احمد شرقپوری نمبر۶۸: ارشادات مجدد۔ جمیل احمد

نمبر۸۵: ارمغان شاہ ولی اللہ۔ لاہور ۱۹۷۱ نمبر۸۶: ارمغان شاہ ولی اللہ۔ لاہور ۱۹۹۷

نمبر۱۲۲: اقبال کے محبوب صوفیا۔ کراچی ۱۹۷۶ نمبر۱۲۳: اقبال کے محبوب صوفیا۔ لاہور ۱۹۷۶

(درست لفظ صوفیہ ہے)

نمبر۲۳۳: بابا فرید۔ لاہور ۱۹۶۲ نمبر۲۳۴: بابا فرید۔ لاہور ۱۹۷۰ء

نمبر۴۲۲: تذکرۃ الواصلین۔ لکھنو ۱۳۱۷ھ نمبر۴۲۳: تذکرۃ الواصلین۔ بدایوں ۱۳۴۵ھ

نمبر۴۵۹: تذکرہ حاجی حسین بخش نوشاہی۔ محمد لطیف نوشاہی

نمبر۴۷۲: تذکرہ حاجی حسین بخش نوشاہی۔ محمد لطیف زاد نوشاہی (درست زار ہے)

نمبر۹۷۳: سوانح حیات حضرت میانمیر۔ لاہور۔ س ن نمبر۹۷۴: سوانح حیات حضرت میانمیر۔ لاہور ۱۹۹۳ء

نمبر۱۰۱۱: سید احمد شہید۔ مسعود وحید احمد لاہور۔ س ن

نمبر۱۰۱۲: سید احمد شہید کی صحیح تصویر۔ وحید احمد مسعود، لاہور ۱۹۶۷

(یہ نہ تو دو الگ الگ کتابیں ہیں اور نہ ہی ان کے الگ الگ مصنف بلکہ یہ ایک ہی کتاب ہے جسے پہلے نامکمل نام کے ساتھ اور بعد میں مکمل نام کے ساتھ درج کر دیا گیا ہے)

۱۱۱۲: شیخ نظام الدین اولیاء۔ دہلی ۱۹۸۵ء نمبر۱۱۱۳: شیخ نظام الدین اولیاء۔ دہلی ۱۹۹۸ء

۱۲۵۴: کشف المحجوب۔ مرتبہ ژوکوفسکی با مقدمہ قاسم انصاری تہران، ۱۳۷۱ھ

نمبر۱۲۵۵: کشف المحجوب مرتبہ ژوکوفسکی، مقدمہ ژوکوفسکی۔ تہران ۱۳۷۱ھ

(یہ ایک ہی ایڈیشن ہے جسے ایک مرتبہ قاسم انصاری کے مقدمے کے ساتھ اور دوسری مرتبہ ژوکوفسکی کے مقدمے کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ دراصل یہ ایڈیشن ژوکوفسکی کی تصحیح اور قاسم انصاری کے مقدمے کے ساتھ تہران سے اول مرتبہ

۱۳۹۹ھ میں چھپا۔ لہٰذا ۱۳۷۱ھ بداہتہً غلط ہے۔

۲۵۔ کتاب میں ہر شخصیت کی ابتدا میں ستارے کا نشان بنایا گیا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ اب یہاں سے نئی شخصیت کا آغاز ہوتا ہے مگر یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ بعض مقامات پر ایک ہی شخصیت کا نام ہجائی ترتیب میں مکرر بلکہ سہ کرر الگ الگ ستاروں سے دکھایا گیا ہے۔ مگر مآخذ مذکورہ شخصیت کے الگ الگ دکھائے گئے ہیں اور انہیں یکجا نہیں کیا گیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تذبذب کا شکار ہیں اور انہیں یکجا کرنے کا فیصلہ نہیں کر پائیں۔ حالانکہ اسماء، سنین وفات، مقامات مدفن وغیرہ میں کسی قسم کا ابہام نہیں ہے۔ اس موقع پر صرف حرف ''ر'' میں سے مکررات کی مثالیں پیش کی جا رہی ہیں وگرنہ ساری کتاب میں ایسی مثالیں آپ کو جستہ جستہ نہیں بلکہ دستہ دستہ مل جائیں گی۔

ص۱۸۲۔ رحمت اللہ شیخ ص۱۸۲۔ رحمت اللہ پشلو

ص۱۸۳۔ رحمت اللہ سہروردی ص۱۸۷۔ رسول شاہ

ص۱۸۸۔ رشید الدین گجراتی ص۱۸۸۔ رضا قادری شطاری

ص۱۸۹۔ رضی الدین بھاگلپوری ص۱۸۹۔ رضی الدین کاکوری

ص۱۸۹۔ رضی الدین گنج علم ص۱۸۹۔ رضی الدین کنجاہی

ص۱۸۹۔ رضی الدین منصور ص۱۸۹۔ رفعۃ الدین

ص۱۹۰۔ رفیع الدین دیوبندی ص۱۹۳۔ رکن الدین جونپوری

ص۱۹۴۔ رکن الدین فردوسی ص۱۹۶۔ روپی ریشی

ص۱۹۶۔ روح اللہ ص۱۹۷۔ روزبہ حاجی بابا

ص۱۹۸۔ ریگی ریشی

۲۶۔ بعض کتابوں کے مصنفین کا عرفی نام نہیں لکھا گیا جس سے یہ تمیز کرنا ممکن نہیں کہ کتاب کس مصنف کی ہے۔ جیسے: تجلیات امام ربانی (نمبر۳۷۹) اور تذکرہ اکابر اہل سنت (نمبر۴۲۷) ان دونوں کتابوں کے مصنف کا نام محمد عبدالحکیم لکھا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں کتابیں ایک ہی مصنف کی ہیں۔ جب کہ اول الذکر کتاب کے مصنف محمد عبدالحکیم اختر شاہجہانپوری ہیں اور موخر الذکر کتاب کے مصنف (مولانا) محمد عبدالحکیم شرف قادری (شیخ الحدیث جامعہ نظامیہ لاہور) ہیں۔

۲۷۔ فہرست کتابیات (عربی، فارسی، اردو) میں بعض کتابوں کے سنین طباعت ان سنین طباعت سے مختلف ہیں جو فارسی فہرست کتب میں دیے گئے ہیں۔ مثلاً:

نمبر۶۵۹: حدیقۃ الاولیاء۔ سید عبدالقادر	۱۹۶۷	
نمبر۱۹۴۳: حدیقۃ الاولیاء۔ سید عبدالقادر	۱۹۷۶	(درست ۱۹۶۷ ہے)
نمبر۶۶۰۔ حدیقۃ الاولیاء۔ مفتی غلام سرور	۱۹۶۷	
نمبر۱۹۴۴: حدیقۃ الاولیاء۔ مفتی غلام سرور	۱۹۷۶	(درست ۱۹۷۶ ہے)
نمبر۱۵۶۱: منتخب التواریخ۔ عبدالقادر بدایونی	۱۲۸۱ھ	
نمبر۱۵۹۲: منتخب التواریخ۔ عبدالقادر بدایونی	۱۲۸۶ھ	(درست ۱۲۸۴ھ ہے)

۲۸۔ لیپوزنگ میں بعض الفاظ جڑ جانے سے مضحکہ خیز صورت پیدا ہوگئی ہے۔ نقل کی ضرورت نہیں۔ ان کی بگڑی ہوئی صورتیں اصل نمبر نکال کر ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

نمبر ۹۰۶ خطی نسخہ دانش گاہ پنجاب

نمبر ۱۲۹۴ دانش گاہ پنجاب

نمبر ۱۵۳۴ بہاء الدین زکریا ملتانی

نمبر ۱۵۵۸ شاہ فضل اللہ شطاری

ص ۲۹۷ مکمل صفحہ جناتی زبان میں

۲۹۔ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی: (نقل مطابق اصل ہے)

نمبر ۳۳۳ تاریخ اولیاء المعروف بالیات ماغیہ فی سلاسل سفیہ۔ عباد اللہ

نمبر ۷۴۷ حیات زار انتخاب کلام مرزا عبدالقادر بیدل

نمبر ۸۷۰ رجال السنہ شاہ حسین گردیزی

نمبر ۹۴۵ سلاج المومنین فی قطع الخارمین۔ لطف الحق

نمبر ۱۱۵۱ عقاید سید میریہ یعنی عقاید حصہ نواب الدین

نمبر ۱۱۶۳ عمرانی نظریہ و تحقیق پروفیسر تگہ لاہور

نمبر ۱۳۱۱ گل مداد ختم لیلۃ الرغائب۔ اقبال خاں جالندھری

نمبر ۱۳۵۱ متن عطائے خواجہ۔ عبداللہ چشتی

نمبر ۱۳۸۵ محمد عمر مہاجر مکی کے احوال و آثار۔ مرتبہ عقیل

نمبر ۱۵۲۸ مکتوبات تعزیت بشارت

۳۰۔ آثار کے آخر میں ۱۰۸ (نمبر ۱۸۹۹ تا ۲۰۰۶) فارسی کتب کی فہرست دی گئی ہے جن میں سے صرف ۱۰ کتابوں کے سوا باقی ۹۸ کتابیں اردو کی فہرست کتب میں بھی شامل ہیں۔ مضمون میں طوالت اور قارئین کے ذہن پر ثقالت کے خوف سے ان کی نشاندہی نہیں کی جارہی۔ قارئین دونوں فہرستیں سامنے رکھ کر بآسانی مکررات معلوم کرسکتے ہیں۔ اسی طرح عربی کی ساتوں کی ساتوں کتابیں اردو فہرست کتب میں بھی شامل کردی گئی ہیں۔

۳۱۔ بعض دو لفظی اسما کو جو اسی طرح معروف اور زبان زد عوام ہیں انہیں ایک مرتبہ درست حالت میں اور دوسری مرتبہ خواہ مخواہ معکوس کردیا گیا ہے۔ ملاحظہ کریں:

ص ۲۳۴ شاہ گدا کو گدا شاہ (ص ۴۴۲)

ص ۲۳۵ شاہ مدار کو مدار شاہ (ص ۵۵۴)

ص ۲۳۴ شاہ کنتھ قادری نوشاہی کو کنتھ قادری نوشاہی (ص ۴۴۱)

ص ۴۰۵ شاہ فرید کو فرید شاہ (ص ۴۰۱)

صحت نامہ کتابیات (ص ۶۴۵ تا ۷۰۹) آثار الاولیاء

شمارہ نمبر	غلط	صحیح	نمبر شمار	غلط	صحیح
۲	شیخ محمد اکرم	شیخ محمد اکرام	۱۷۵	مع اوراد	مع اوراد فتحیہ
۴	مقام اشاعت نامعلوم	مطبع سید الاخبار کراچی	۱۷۷	سنہ ندارد	۱۹۷۵ء
۲۰	صدیق حسین خاں	نواب صدیق حسن خاں	۲۰۵	انوار شمسہ	انوار شمسیہ
۳۱	ابیان مولوی جان محمد	ابیات مولوی جان محمد		خط چشتی	خطبہ چشتیہ
۴۱	سید نفیسی	سید انور حسین نفیس رقم	۲۱۴-۱۶	انوار نوشاہی ۱۳۴۰ھ	انوار نوشاہیہ ۱۳۷۳ھ
۵۲	مطبع احمدی ۱۲۷۵ھ	مطبع احمدی ۱۲۷۰ھ	۲۱۸	عثمان ہروی	عثمان ہرونی
۵۶	ادبی دنیا کشمیر	ادبی دنیا کشمیر نمبر	۲۳۹	یاد اعلیٰ حضرت	یاد اعلیٰ حضرت
۶۱	اذکار قلندر	اذکار قلندری	۲۴۱	بادشاہ نامہ کلکتہ ۱۹۶۸ء	بادشاہ نامہ کلکتہ ۱۸۶۸ء
۷۲	نوری ادارہ	نوری کتب خانہ	۲۴۵	باقی ہندوستان سنہ ندارد	باقی ہندوستان ۱۹۷۴ء
۱۰۲	اسماء الاسرار	اسمار الاسرار		محمد افضل حق	محمد فضل حق
۱۰۷	تذکرہ از وفات حضرت	تذکرہ حضرت نور المشائخ	۲۵۳	فی زیادۃ	فی زیارۃ
	نور المشائخ		۳۰۹	تاجدار الاحسان ۱۳۰۳ھ	تاجدار دار الاحسان ۱۴۰۳ھ
	احسان اللہ	ضیاء المشائخ محمد ابراہیم مجددی	۳۱۴	محمد داؤد زبیر	محمد داؤد رہبر
۱۲۲	اقبال کے محبوب صوفیا	اقبال کے محبوب صوفیہ	۳۲۴	محمد دین حکیم	محمد دین کلیم
۱۳۱	الافاضات السنیہ	الافاضات السنیہ	۳۳۹	تاریخ تناولیاں ۱۸۷۵ء	تاریخ تناولیاں ۱۸۷۸ء
	فتاوی مہریہ	فتاوی مہریہ			(طبع ثانی ۱۹۷۵ء)
۱۳۵	انچہ الفائحہ	التحفۃ الفائحہ	۳۴۰	خادم علی۔ سنہ ندارد	آفتاب بیگ ۱۳۳۳ھ دہلی
۱۳۶	ملفوظ المخدوم سنہ ندارد	ملفوظ المخدوم	۳۴۱	تاریخ جلیلہ ۱۹۴۰	تاریخ جلیلہ ۱۹۶۰ء
		طبع اول ۱۳۰۹ھ دہلی			(طبع اول ۱۹۳۷ء)
		طبع ثانی ۱۳۷۷ھ ملتان	۳۵۶	تاریخ فرشتہ دکن ۱۱۹۸ھ	تاریخ فرشتہ لکھنؤ ۱۸۶۴ء
۱۳۸-۹	الروض المجود	الروض المجود			بمبئی ۱۸۳۲ء
۱۴۲	العقائد اسنیہ	العقائد السنیہ	۳۵۷	تاریخ فیروز شاہی۔	تاریخ فیروز شاہی کلکتہ ۱۸۶۲ء
۱۴۹	المجمل المعد والتالیفات المجد	المجمل المعد والتالیفات المجد		علی گڑھ ۱۹۵۵ء	
۱۵۰	محمد مصطفی خاں	محمد مصطفی رضا خاں	۳۶۸	استیالی	استیلائی
۱۷۲	سید اشرف ظفر	سیدہ اشرف ظفر	۳۹۴	جالدھر	جالندھر
۱۷۴	انتہاء المومنین	انتباہ المومنین	۴۰۴	تحقیقات چشتی سنہ ندارد	تحقیقات چشتی ۱۳۲۴ھ

شمارہ نمبر	غلط	صحیح
۴۰۳	عبدالقادر	عبدالقاہر
۴۱۹	جھنجر	جھجھر
۴۲۴	غلام سید	غلام بن سید محمد
۴۳۵	خوارق للعادات	خوارق العادات
۴۴۱	تذکرہ اولیائے کرام ۱۹۷۱ء	تذکرہ اولیائے کرام ۱۹۸۰ء
۴۵۱	نوراحمد خاں فرید	نوراحمد خاں فریدی
۴۷۲	محمد لطیف زاو	محمد لطیف زار
۴۷۶	میراں حسین زنجانی ۱۳۸۳ھ	میراں حسین زنجانی ۱۳۸۳ھ
۴۸۵	ضیاءالدین زکریا	بہاءالدین زکریا
۴۹۰	تذکرہ حافظ پشاور	تذکرہ حفاظ پشاور
۵۰۶	تذکرہ سید بشارت ۱۳۸۱ھ	تذکرہ سید بشیر احمد بشارت ۱۳۸۱ھ
۵۱۹	سیاح الدین کاخیل	سیاح الدین کاکاخیل
۵۲۵	نورالدین احمد	نوراحمد خاں فریدی
۵۳۸	لمعات احمد بغوی	ابرار احمد بگوی
۵۳۹	تذکرہ علمائے مشائخ	تذکرہ علماء و مشائخ
۵۵۴	احمد علی خاں معشوق	احمد علی خاں شوق
۵۵۷	محدث سواتی	محدث سورتی
۵۶۱	شیر علی	شیر خاں لودھی
۵۹۱	عبدالاجد دریا آبادی	عبدالماجد دریابادی
۵۹۷	شاہ گل حسین	شاہ گل حسن
۶۰۹	توارخ عجیبہ	تواریخ عجیبہ
۶۱۰	توزک جہانگیری ۱۹۶۴ء	توزک جہانگیری ۱۸۶۴ء
۶۲۳-۲۵	جمعیت	جمعیت
۶۳۲	محمد ایوب نقشبندی	محمد یوسف نقشبندی
۶۳۷	چراغ الخشیت	چراغ چشت
۶۵۳	فی ذکر النبی	فی ذکر النبی الحبیب
۶۵۴	حدایق بالحنفیہ	حدائق الحنفیہ
۶۶۱	حدیقۃ الحنفیہ	حدائق الحنفیہ
۶۶۶	حسنات العرفین۔ عبداللہ	حسنات الحرمین۔ عبیداللہ

نمبر شمار	غلط	صحیح
۶۶۷	حسنت العارفین	حسنات العارفین
۶۸۰	فضل احمد شان	فضل احمد خاں
۶۹۷	شریف گنجاہی	شریف کنجاہی
۷۱۷	عبدالغفار انصاری	عبدالغفار انصاری
۷۳۱	دکایات می کنم	حکایت می کنم
۷۳۳	پیام شاہجہانی	پیام شاہجہانپوری
۷۳۴	شبیر احمد شرقپوری	شیر محمد شرقپوری
	ملک حسن	ملک حسن علی
۷۴۳	تقی محمد خاں	نقی محمد خاں خورجوی
۷۴۸	محمد سعید شرقوری	محمد سعید شرقپوری
۷۵۳	خلیق احمد خاں	خلیق احمد نظامی
۷۵۷	غلام سرور اتا	غلام سرور رانا
۷۷۹	خزانہ عامرہ ۱۱۷۶ھ	خزانہ عامرہ ۱۸۷۱ء
۷۸۳	تذکرہ مشائخ نقشبندیہ	تذکرہ عاشق ربانی شیریزدانی
۷۹۹	علاؤالدین	علاءالدین
۸۲۸	محمد حسن نقشمدی	محمد حسن نقشبندی
۸۲۹	امرتسر	لاہور
۸۳۱	شیخ محمد اکرم و دکتر وحید قریدی	شیخ محمد اکرام و دکتر وحید قریشی
۸۴۱	قاض اطہر مبا کپوری	قاضی اطہر مبارکپوری
۸۵۲	اخرت حسین	اختر حسین
۸۵۶	محمود طاہر	محمود عالم ہاشمی
۸۷۱	مرکز تحقیقت	مرکز تحقیقات
۸۷۳	مرزا مظہر	میرزا مظہر
۸۹۴	روضۃ الذکیہ۔ ۱۹۷۸ء	روضۃ الزکیہ۔ ۱۳۷۸ھ (مخطوطہ)
۹۰۱	آفتاب رای	آفتاب رائے
۹۰۶	مجموع شیرانی	مجموعہ شیرانی
۹۰۸	محمد ہاشم کاشمی	محمد ہاشم کشمی
۹۴۷	کشمیری شروکوں	کشمیری شلوکوں
۹۴۹	سلسلۃ الزہب	سلسلۃ الذہب

شمارہ نمبر	غلط	صحیح
۹۵۲	ایک جمالی نقش	ایک اجمالی نقش
۹۶۶	مقامات اخیار	مقامات خیر
۹۹۳	محمد احسان دہلی	محمد احسان اللہ عباسی رامپور
۱۰۰۴	مولف نامعلوم	مولف شاہ کلیم اللہ جہان آبادی
۱۰۰۸	سیاح االامکان	سیاح لامکان
۱۰۲۰	سیر المتاحسین	سیر المتاخرین
۱۰۳۱	ناطق کالنوری	ناطق کالنوری
۱۰۳۳	ابالرضا نوراللہ	ابوالرضا نوراللہ مرقدہ
	سید ابوالحسن ندوی	سید ابوالحسن علی ندوی
۱۰۳۴	الشہید	شہید
۱۰۴۴	سیطالحسن	سبط الحسن
۱۰۴۵	غلام علی	مہر علی شاہ
۱۰۵۰	شاہدات و معارف	مشاہدات و معارف
۱۰۶۰	شاہ ولی اللہ دہلوی کے	شاہ ولی اللہ دہلوی کے
	سیاسی مکتوبات ۱۳۶۹ھ	سیاسی مکتوبات ۱۹۶۹ء
۱۰۶۱	غلام حسین جیلانی	غلام حسین جاپانی
۱۰۷۳	بہاؤالدین بہ	بہاءالدین
۱۰۷۵	شرف المناقب	شرف المناقب (بلا مترجم)
	مترجم چرن لال	
۱۰۸۹	رواتح الاذہار	روائح الازہار
۱۰۹۱	درعہد شاہر	درعہد شاطر
۱۰۹۴	شارع نور	شمع نور
۱۱۰۹	شیخ الشیوخ عالم	شیخ شیوخ العالم
۱۱۱۷	صحیفہ نور ۱۳۸۰ھ	صحیفہ نور ۱۳۸۰ھ (مخطوطہ)
۱۱۲۳	صفاء الضمائر	مقال الضمائر
۱۱۳۸	طبقات الصوفیہ سنہ ندارد	طبقات الصوفیہ ۱۹۶۳ء
۱۱۴۳	عاشق رسول ۱۳۰۱ھ	عاشق رسول ۱۳۹۶ھ
۱۱۵۳	غلام ہمدانی مصطفی	غلام ہمدانی مصحفی
۱۱۷۹	فاضل بریلوی معاشی نکات	فاضل بریلوی کے معاشی نکات

نمبر شمار	غلط	صحیح
۱۱۹۹	فقہائے ملتان، عمر کمان	فقہائے ملتان، عمر کمال
	خاں، سنہ ندارد	خاں، ۱۹۸۳ء
۱۲۰۲	فوائد الفواد ۱۹۶۳ء	فوائد الفواد ۱۹۶۶ء
۱۲۰۷	محمد ارتضی علمی خاں	محمد ارتضی علی خاں
۱۲۳۳	کالاپانی تو ارخ عجیب	کالاپانی عرف تاریخ عجیبہ
۱۲۵۰	حضرت کمانوالے	حضرت کرمانوالے
۱۲۵۲	کشف الحقاق	کشف الحقائق
۱۲۵۴	زرزو کوفسکی	ژ ژو کوفسکی
۱۲۵۷	علی قدیم	علی قویم
۱۲۶۳	القاہر	القاہم
۱۲۷۸	کلیات باقی باللہ، سنہ ندارد	کلیات باقی باللہ ۱۹۶۷ء
۱۲۸۱	کلیات بیدل	کلیات بیدل (انتخاب)
۱۲۸۴	خواجہ باقی اللہ	خواجہ باقی باللہ
۱۳۰۹	گلشن ہند مرزا علی خاں، دکن۔	گلشن ہند میرزا علی لطف
	سنہ ندارد	لاہور ۱۹۰۶ء
۱۳۳۴	لمعات۔ ۱۹۶۷ء	لمحات۔ ۱۹۶۶ء
۱۳۳۵	لمعات	لمحات
۱۳۴۰	جزدوم۔ مآثر لاہور	(کتاب ایک ہی جز میں مکمل ہے)
۱۳۴۶	شمس العارفین	شمس العارفین نمبر
	مدیر محمد اکرم	مدیر محمد کرم شاہ ازہری
۱۳۵۴	جمالید ہلوی	جمالی دہلوی
۱۳۵۹	سید احمد سرہندی	شیخ احمد سرہندی
۱۳۶۶	مجموعی شیرانی	مجموعہ شیرانی
۱۳۶۸	محمد فضل الدین قومی	محمد فضل الدین تاجران کتب قومی
۱۳۷۶	محبت اہل دل	صحبتے باأہل دل
۱۳۷۷	محمد سلیمان گیلانی	محمد سلیمان گیلانی
۱۳۸۳	نکات الفقرا	تحف الفقرا
۱۳۸۶	محمد فاضل بریلوی	فاضل بریلوی

شمار و نمبر	غلط	صحیح
۱۳۸۸	عبداللہ محمد	غلام احمد شوق
۱۳۹۱	اکرم حسین	اکرام حسین
۱۳۹۵	محمد عمر بریلوی	محمد عمر بیربلوی
۱۳۹۷	شرف الدین احمد	شرف الدین احمد
۲۲-۱۴۲۰	امرزا۔ عبدالرزاق	میرزا۔ عبدالرزاق
۱۴۳۴	اکبرکابادی	اکبرآبادی
۱۴۳۶	لاور	لاہور
۱۴۴۰	مولوی محمد حسنی	مولوی محمد حسن
۱۴۴۲	معروف وارثیہ	معروف بمعارف وارثیہ
۱۴۴۹	مجموعہ شیران	مجموعہ شیرانی
۱۴۵۱	سید احمد ریاست علی قادری	سید ریاست علی قادری
۱۴۶۹	مقابس المجالس	مقابیس المجالس
۱۴۸۷	مقصود حمید احمد عمری	مقصود احمد عمری رامپوری
۱۵۱۱	لاہور	امرتسر
۱۵۲۰	غلام حسین معین الدین	غلام معین الدین
۱۵۲۱	جامعہ الکمالات شاہ فقیر اللہ علی کرم بخش	جامع الکمالات شاہ فقیر اللہ علوی مرتبہ: مولوی سید میر علی نواز شاہ
۱۵۲۴	مکتوبات کلیمی، حکیم اللہ ۱۳۰۱ھ	مکتوبات کلیمی کلیم اللہ ۱۳۱۵ھ
۶۳-۱۵۶۲	انتخابات۔ حسین علمی	منتخبات۔ حسین حلمی
۱۵۶۶	محمد نجیب اللہ	محمد مجیب اللہ
۱۵۶۸	مواہب االقلندر	مواہب القلندر
۱۵۷۵	مہکدے پھل ۱۹۰۰ء	مہکدے پھل ۱۹۵۸ء
۱۵۷۶	مولانا محمد الیاس اوران کی خدمات۔ سن ندارد	مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت ۱۹۴۷ء
۱۶۱۹	محمد اکرم	محمد عالم مختار حق
۱۶۲۸	نور القلوب مزکور	نور القلوب مذکور
۱۶۳۶	وامقا سعید	وفقا سعید

نمبر شمار	غلط	صحیح
۱۶۴۰	وصال احمدی سن ندارد	وصال احمدی ۱۳۹۶ھ
۱۶۵۴	ہفت الاقطاب۔ معین	ہفت اقطاب۔ معینی
۱۶۶۱	پنجاب یونیورسٹی لائبریری	انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۷۳ء
۱۸۹۵	نزہۃ الخواطر ۱۰۷۵ھ	نزہۃ الخواطر ۱۳۹۶ھ (طبع دوم)
۱۸۹۸	عبدالحئی	ابوالحسن علی ندوی
۱۸۹۹	آئین اکبری دہلی ۱۹۷۴ء	آئین اکبری بمبئی ۱۸۵۵ء
۱۹۰۳	محمود ذوالقرنین	محمد ذوالقرنین
۱۹۰۹	اورادِ فتحیہ	اوراد فتحیہ
۱۹۱۷	بشیر حسن چشتی	شبیر حسن چشتی نظامی
۱۹۱۹	المعصوم	الموسوم
۱۹۲۲	تاریک کشمیر کبیر	تاریخ کشمیر کبیر
۱۹۲۲	یحیٰ الدین مسکین	معین الدین مسکین
۱۹۳۲	تذکرہ شعرائے کشمیر ۱۳۳۶ھ	تذکرہ شعرائے کشمیر جلد اول ۱۹۶۷ء (طبع اول) ۱۹۸۳ء (طبع دوم)
۱۹۳۶	نتائج الابار	نتائج الافکار
۱۹۳۹	توزک جہانگیری ۱۹۶۳ء	توزک جہانگیری ۱۸۶۳ء
۱۹۴۰	تیسر الشاغلین فیروز پور روڈ	تیسیر الشاغلین فیروز پور
۱۹۴۳	عبدالقدر ۱۹۷۶ء	عبدالقادر ۱۹۶۷ء
۱۹۵۲	نقی علی قلندر	تقی علی قلندر
۱۹۵۸	سفینۃ الاولیا ۱۰۴۹ھ	سفینۃ الاولیا ۱۲۹۵ھ
۱۹۵۹	الحسیتی المثانی	الچشتی العثمانی
۱۹۶۸	احمد صالح کموہ	محمد صالح کنبوہ
۱۹۷۴	کلمات طیبات	کلمات قدسیہ المعروف بہ فیض نقشبندیہ
۱۹۸۸	مکاتب فخریہ	مکاتیب فخریہ
۲۰۰۱	محمد ناس عندلیب	محمد ناصر عندلیب
۲۰۰۶	امین احمد راشی	امین احمد رازی

انجمن ترقی اردو کی نئی مطبوعات۔ ایک جائزہ

محمد ہارون عثمانی

جس پودے کو نواب محسن الملک نے اگایا تھا اور جسے بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنے خون سے سینچا تھا، آج جمیل الدین عالی اور آفتاب احمد خان کی باغبانی میں خوب پھل دے رہا ہے۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کے ثمرات میں اردو کالج ریونیورسٹی اور اصطلاحات سازی کے علاوہ اردو زبان و ادب کے حوالے سے گراں قدر مطبوعات بھی شامل ہیں۔ ذیل میں انجمن ترقی اردو کی چار نئی مطبوعہ کتب کا اجمالی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ جس سے انجمن کی اردو زبان و ادب کے ضمن میں خدمات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

شاہد احمد دہلوی: حالات و آثار

از ڈاکٹر سید محمد عارف

شاہد احمد دہلوی کی وجہ شہرت میں ''ساقی'' کی ادارت، خاکہ نگاری، رپورتاژ نگاری، ترجمہ نگاری اور موسیقی کے علاوہ ان کے خاندانی پس منظر اور مخصوص مزاج کا دخل بھی ہے۔ شاہد احمد مشہور ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے تھے۔ وہ تمام عمر اپنے مخصوص مزاج کی وجہ سے ہم عصروں سے برسرپیکار ہی رہے۔ ان کے ادبی معرکوں نے لازوال شہرت پائی۔ زیر تبصرہ کتاب اسی نابغہ روزگار ادیب کے حالات زندگی اور کارناموں کا احاطہ کرتی ہے۔ اس تحقیق کے نتیجے میں ڈاکٹر سید محمد عارف پی ایچ ڈی کی ڈگری کے سزاوار بھی ٹھہرے ہیں۔

مقالے کو نو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب شاہد احمد دہلوی کے حالات زندگی کی زندہ تصویر پیش کرتا ہے۔ محقق نے شاہد احمد کے شجرہ نسب کا سراغ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک لگایا ہے۔ اس کے علاوہ اس باب میں شاہد احمد کے خاندانی ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی تعلیم و تربیت، معاش، ازدواج و اولاد اور سیرت و کردار کی مکمل تفاصیل بھی پیش کی گئی ہیں۔

دوسرا باب ماہنامہ ''ساقی'' پر قائم کیا گیا ہے۔ جس میں ساقی کے اجراء سے لے کر اس کے سرورق، مضمون نگار، شاہد احمد کی ادارت وغیرہ کے اذکار شامل ہیں۔ ادبی معرکوں کا تذکرہ بھی تفصیل سے ملتا ہے۔ بقول مقالہ نگار ''ساقی'' کے آغاز اشاعت سے ہی یہ معرکہ آرائیاں شروع ہوئی تھیں جو آخر دم تک جاری رہیں۔ جہاں شریف قمری، مولانا سلیمان ندوی، شبیہ الحسن، ل یوسف، محمد طفیل اور جوش ملیح آبادی جیسے حریف ہوں وہاں آپ معرکوں کی شدت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

''ساقی'' کے بعد شاہد احمد کا سب سے بڑا تخلیقی کارنامہ ان کے خاکے ہیں۔ اس ضمن میں خواجہ حسن نظامی، میر ناصر علی،

علامہ راشد الخیری، عظیم بیگ چغتائی، سید رفیق حسین، مولوی احتشام الدین، میرا جی اور جگر مراد آبادی پر لکھے ہوئے خاکے سلاست، روانی، بے ساختگی اور والہانہ پن کا عمدہ نمونہ ہیں۔ تیسرا باب شاہد احمد کی خاکہ نگاری سے متعلق ہے جس میں ان کے خاکوں کو خاکہ نگاری کے فنی محاسن کی روشنی میں پرکھا گیا ہے۔

چوتھے باب میں شاہد احمد بطور ثقافت دہلی کے مورخ و مصور سامنے آتے ہیں۔ وہ دہلی کی تہذیب و ثقافت سے والہانہ لگاؤ رکھتے تھے۔ ''اجڑا دیار'' کے مضامین کی روشنی میں محقق نے اسی والہانہ پن کا تحسین و تجزیہ نہایت خوبی سے کیا ہے۔ پانچویں اور چھٹے باب میں بالترتیب شاہد احمد کی رپورتاژ نگاری اور ترجمہ نگاری پر بات کی گئی ہے۔ جبکہ ساتواں باب شاہد احمد کی موسیقی سے دلچسپی اور عبور سے متعلق ہے۔

آٹھویں باب کو ہم اس کتاب کا حاصل کہہ سکتے ہیں۔ اس باب میں محقق نے شاہد احمد کی انشا پردازی کے ادوار کا ذکر کرتے ہوئے ان کے اسلوب کی خصوصیات کا تجزیہ نہایت مہارت سے کیا ہے جس سے محقق کی تجزیاتی صلاحیت اور تنقیدی بصیرت کا اظہار ہوتا ہے۔

محقق نے تحقیق کے لوازم کو سامنے رکھ کر کام کیا ہے۔ حواشی ابواب کے آخر میں دیے ہیں یوں تحریر کا تسلسل ٹوٹنے نہیں پاتا۔ کتاب کے آخر میں دی گئی کتابیات محقق کے گہرے مطالعے کی نشان دہی کرتی ہے لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ کتابیات سے قبل دی گئی شاہد احمد دہلوی کی تصانیف اور تحریروں کا تعارف حالات زندگی والے باب کے بعد پیش کر دیا جاتا تا کہ قارئین شاہد احمد کے تخلیقی کارناموں سے شروع میں ہی واقف ہو جاتے۔ مقالہ نگار نے سادہ زبان کا استعمال کیا ہے جس کی وجہ سے دلچسپی کا عنصر قائم رہتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں تشنگی کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے خاص طور پر شاہد احمد کی ترجمہ نگاری اور ادبی معرکے پر مزید کام کی گنجایش ہے۔ لیکن اپنے موضوع کے حوالے سے مقالہ مکمل ہے اور شاہد احمد دہلوی کے حالات زندگی اور کارناموں کا اجمالی جائزہ پیش کرتے ہوئے اسی موضوع پر تحقیق کے نئے افق کی نشاندہی کرتا ہے۔

میرے زمانے کی دلّی

از ملا واحدی دہلوی

''میرے زمانے کی دلّی'' پہلی مرتبہ ساقی بک ڈپو کراچی نے ۱۹۵۶ء میں شائع کی تھی۔ یہ کتاب عرصے سے نایاب تھی اب کچھ ترمیم و اضافہ کے ساتھ انجمن ترقی اردو نے اسے دوبارہ زیور طبع سے آراستہ کیا ہے۔

ملا واحدی اس دلّی کی ثقافت و تہذیب کے پروردہ تھے جس کے نشانات شاید خود موجودہ دلّی میں بھی نہ ملیں۔ دلّی سے ملا واحدی کے خاندان کا تعلق دو تین نسلوں سے تھا۔ مصنف نے تقریباً نصف صدی وہاں گزاری۔ ۱۹۴۷ء میں دلّی سے نکلے اور پھر کراچی میں ہی جم گئے لیکن یہ ان کا ناسٹل جیا تھا جس نے انہیں یہ کتاب لکھنے پر مجبور کیا۔ ''میرے زمانے کی دلّی'' کو آپ ہزار داستان کہہ سکتے ہیں یا پھر طلسم ہوش ربا۔ ہزاروں نام ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کا ناسٹل جیا کتنا شدید ہے۔ یہ بیک وقت سوانح عمری بھی ہے، تذکرہ بھی ہے اور نوحہ بھی۔ سوانح عمری میں مصنف کے حالات زندگی، تعلیم و معاش وغیرہ کا ذکر ہے۔ تعلیمی اداروں کا ذکر ہوتا ہے تو پھر مشن دلّی سکول، گورنمنٹ ہائی سکول، اینگلو عربک ہائی سکول، اینگلو سنسکرت ہائی اسکول اور شاہزدہ ہائی اسکول کے بارے میں معلوم ہوتا ہے۔ مصنف کو عربک سکول سے خاص نسبت تھی۔ دلّی میں اس سکول نے بڑی بڑی شخصیات کو جنم دیا۔ یہاں کسی زمانے میں مولانا الطاف حسین حالی بھی پڑھاتے رہے تھے۔ ملا واحدی اپنے اساتذہ کا ذکر بہت احترام سے کرتے ہیں۔ خاص طور پر ہیڈ ماسٹر خواجہ شہاب الدین کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ پڑھاتے کم تھے انسانیت زیادہ سکھاتے تھے۔

تذکرے میں عالموں فاضلوں، ادیبوں، سیاست دانوں اور تاجروں سے لے کر عوامی طبقہ سے تعلق رکھنے والے کباب فروشوں، پتنگ بازوں، خوانچہ فروشوں اور دوسرے طبقوں کا دلآویز ذکر ملتا ہے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں ایک طرف شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، شاہ اسمٰعیل، مفتی کفایت اللہ، داغ دہلوی، وحیدالدین بے خود، نواب سراج الدین ساہل، آغا شاعر قزلباش، مولانا عبدالرحمٰن راسخ، منشی ذکاء اللہ، مولانا راشد الخیری، محمد حسین آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خان کے اذکار اس کتاب میں موجود ہیں وہیں چچا کبابی، بڑے میاں پتنگ فروش اور طوائف موتی جان کا تذکرہ بھی خوبصورت انداز میں موجود ہے۔

یہ کتاب دلّی کا نوحہ بھی ہے۔ ملا واحدی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''ایک یہ دلّی صاحب ہیں کہ پیچھا نہیں چھوڑتیں، اور دلّی کے عشاق ہیں جو اکساتے رہتے ہیں کہ دلّی کو تم نہ روؤ گے تو اور کون روئے گا۔ کوئی مستقل رونا روتے جاؤ''۔

ملا واحدی کی شہرت کا ایک اہم سبب ماہنامہ نظام المشائخ بھی ہے جو وہ خواجہ حسن نظامی کے ساتھ مل کر نکالا کرتے تھے۔ اسی رعایت سے انہوں نے اس زمانے کی دلّی کے کوچہ صحافت کی سیر بھی کروا ڈالی ہے۔

ملا واحدی کی تحریر کے عناصر ترکیبی میں سادگی اور سلاست سب سے اہم ہیں۔ اگر آپ خاص دلّی والوں کی روزمرہ ٹکسالی زبان کا مزہ لینا چاہتے ہیں تو ''میرے زمانے کی دلّی'' ضرور پڑھیں۔

جدید اردو افسانے کے رجحانات

از ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش

''جدید اردو افسانے کے رجحانات'' ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کا پی ایچ ڈی کا ضخیم مقالہ ہے جس میں افسانے کے ابتدائی خدوخال سے لے کر اردو افسانے کے ارتقا کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مقالہ نگار نے جدید اردو افسانے کے ابتدائی نقوش اور اس کے پس منظر میں افسانے کے رومانی دور سے لے کر حقیقت پسندی اور ترقی پسند رجحانات تک سماجی، معاشی اور تہذیبی تبدیلیوں سے پیدا ہونے والی نفسیاتی کشمکش اور دیگر رویوں کا تفصیلی تجزیہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان پر مغربی تراجم کے پڑنے والے اثرات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

پورے مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے جبکہ ''اردو افسانے کے پچاس سال'' کا جائزہ بطور ضمیمہ شامل ہے۔ باب اول میں مقالہ نگار نے افسانے کے ابتدائی خدوخال اجاگر کرتے ہوئے افسانے کے مقبی دیار کے ڈانڈے اساطیر سے بھی آگے

نامعلوم کی سرحدوں سے ملا دیے ہیں۔ افسانے کے ابتدائی نقوش کی تلاش پیرابل سے شروع ہوتی ہے اور فیبل (Fable)، کارٹونوں، دیومالا، لیجنڈ (Legend) تمثیل اور رومان سے ہوتی ہوئی ایپک (Epic) تک پہنچتی ہے۔ مقالہ نگار کہانی اور افسانے کا فرق بیان کرتے ہوئے کہانی کو خارجی زندگی کی عکاس اور افسانے کو داخلی زندگی کا ترجمان قرار دیتا ہے۔ اس نے داستان پر ایک نظر ڈالتے ہوئے مروجہ تعریفات کی روشنی میں افسانے کے نقوش بھی ابھارنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس کے مطابق جدید افسانے کو پرانے طرز کے افسانے پر فوقیت حاصل ہے۔ اسی باب میں اردو افسانے کے ارتقائی سفر کی روداد بھی ہے جو بیسویں صدی میں سجاد حیدر یلدرم، منشی پریم چند اور علامہ راشد الخیری پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔

باب دوم جدید اردو افسانے کا پس منظر بیان کرتا ہے جس میں رومانی تخیل آفرینی، حقیقت نگاری، معاشی و معاشرتی کروٹوں کی پیشکش، نفسیاتی و جنسی زاویہ نظر، شعور کی رو، کردار کے ذریعے افسانے کی پیش کش، فسادات کے حوالے سے افسانہ لکھنے کا چلن اور جدید اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش جیسے مباحث پر بات کرنے کے علاوہ غیر ملکی افسانوی ادب اور تراجم کے اثرات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

تیسرے باب کو اس مقالے کی جان کہا جا سکتا ہے۔ اس میں مقالہ نگار نے جدید افسانے کے ان تمام قابل ذکر رجحانات کی تفاصیل پیش کی ہیں جن کی ابتدا بہت عرصہ قبل مغرب میں ہوئی تھی اور جن کے اردو ادب پر مرتب ہونے والے اثرات نے اردو افسانے کو ایک نیا روپ دے دیا ہے۔ ان میں رومانی و نفسیاتی رجحان، علامتی و تجریدی رجحان، سرریلزم، موجودی اساطیری رجحانات نیز ساختیاتی اور پس ساختیاتی زاویہ نظر بھی شامل ہیں۔

باب چہارم اور پنجم، باب سوم کی ہی توسیع ہیں۔ باب چہارم میں جدید افسانہ کو موضوع بنا کر جدیدیت اور جدید افسانہ، کہانی پن کا مسئلہ، کرداری نگاری، عصریت اور روح عصر، ہجرت اور اسلوب کی کارکردگی پر بحث کی گئی ہے۔ باب پنجم جدید اردو افسانے میں معاشرتی آویزش سے متعلق ہے۔

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کا اسلوب تحریر مدلل ہے جو قاری کو اس منطقی نتیجے پر ضرور پہنچاتا ہے کہ اردو افسانے نے ایک قلیل مدت میں (جو بمشکل ایک صدی پر محیط ہے) عالمی افسانے کے سارے ادوار کا مزہ چکھ لیا ہے اور آج وہ نہ صرف مغربی افسانے کے جملہ رجحانات کو اپنے اندر جذب کر چکا ہے بلکہ فنی پختگی کے مدار میں بھی قدم رکھ چکا ہے۔

اردو افسانے کے حوالے سے ڈاکٹر انوار احمد، ڈاکٹر فردوس انور قاضی، شہزاد منظر، ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر نعمت ریحانہ کے تحقیقی و تنقیدی مقالوں کی موجودگی میں ڈاکٹر قزلباش اپنے مقالے میں نئی حقیقتیں سامنے لانے میں کامیاب رہے ہیں۔ کتاب کی پیش کش انجمن ترقی اردو کے اعلیٰ معیار کی آئینہ دار ہے۔ پروف احتیاط سے پڑھے گئے ہیں۔ المختصر اس مقالے کو ایک مستند حوالہ کہا جا سکتا ہے۔

انتخاب کلام: سودا، درد، میر، انشاء، مصحفی، اور آتش

از یونس سعید (مرحوم)

اردو شاعری نے اردو زبان کے ساتھ ساتھ ارتقائی منزل طے کی ہیں۔ مختلف ادوار میں مختلف شعرا اس کی ترقی میں اپنا

حصہ ڈالتے رہے ہیں۔ حضرت امیر خسرو کو اردو شاعری کا بانی مانا جاتا ہے۔ جبکہ محمد قلی قطب شاہ کو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر کہا گیا ہے اور اسی طرح سترھویں صدی عیسوی میں ولی دکنی نے اپنا لوہا منوایا۔ اردو کے دیگر متقدمین شعرا میں آبرو، آرزو، سراج اورنگ آبادی، مرزا مظہر جان جاناں، شاہ حاتم وغیرہ نے بھی اردو شاعری کی بنیادوں کو استحکام بخشا۔ اردو شاعری کے دور متوسطین کے شعرا میں سودا، درد، میر، انشا اور مصحفی وغیرہ نے بھی اردو شاعری کے باغیچے کی اپنے سخن سے آبیاری کی۔ دور متاخرین کے اہم شعرا میں آتش، غالب، ذوق وغیرہ کے اسما آتے ہیں۔ یہ سلسلہ رکا نہیں ہے بلکہ جدید اور جدید تر ادوار سے گزر کر اکیسویں صدی کے جدید ترین دور میں داخل ہو گیا ہے۔

یونس سعید نے دور متوسطین کے پانچ شعرا سودا، درد، میر انشا اور مصحفی اور دور متاخرین میں سے آتش کے کلام کے جو انتخاب کیے تھے، جمیل الدین عالی، امراؤ طارق، ادیب سہیل اور شہاب فدوائی نے انہیں انتخاب کلام کے عنوان سے انجمن ترقی اردو پاکستان کے لیے ترتیب دے دیا ہے۔

پہلا انتخاب مرزا محمد رفیع سودا کے کلام کا ہے جو تقریباً سو صفحات کو محیط ہے۔ اس میں سودا کی غزلوں، اشعار اور قطعات پر مشتمل منتخب کلام موجود ہے۔ قصائد البتہ شامل نہیں کیے گئے ہیں۔ انتخاب اگرچہ مرتب کی محنت اور عرق ریزی کی عکاسی کرتا ہے لیکن اس انتخاب کو ہم مکمل طور پر سودا کا نمائندہ کلام نہیں کہہ سکتے ہیں۔ ان کی کئی مشہور زمانہ غزلیں اور اشعار اس میں شامل نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی غزل جس کا مطلع ہے:

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

اس انتخاب کا حصہ نہیں ہے۔

دوسرا انتخاب خواجہ میر درد کا ہے۔ درد کی شاعری عشق حقیقی اور تصوف کے مختلف مسائل سے عبارت ہے۔ سب سے بڑا انتخاب کلام میر تقی میر کا ہے۔ اس میں میر کے چھ کے چھ دواوین سے کلام منتخب کیا گیا ہے۔ ہر دیوان سے علیحدہ علیحدہ انتخاب کر کے انہیں ردیف وار ترتیب دیا گیا ہے۔ میر کے کلام کے انتخاب میں مرتب نے انتہائی احتیاط اور مہارت سے کام لیا ہے۔ میر کو خدائے سخن کہا جاتا ہے۔ ان کے کلام کا انتخاب کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ان کی شاعری واردات قلبی اور درد و غم کی عکاس ہے۔ میر کے محبوب موضوعات میں عشق کی ستم انگیزی، دنیا کی بے ثباتی، یاس و حرماں اور فقر و قناعت شامل ہیں۔ انتخاب میں میر کے یہ تمام رنگ جھلکتے ہیں۔ انشا، مصحفی اور آتش کے انتخاب کلام بھی ان شعرا کے مخصوص انداز سخن کے عکاس ہیں۔ مرتب نے انتخاب کا حق ادا کر دیا ہے۔

پروف کی چند غلطیوں سے قطع نظر کتاب کی پیش کش خوب صورت ہے۔ چھ معروف اور رجحان ساز شعرا کا کلام ایک ہی کتاب میں اکٹھا کر کے مرتبین نے ادب کے قارئین کے لیے اہم خدمت سرانجام دی ہے۔

مختصر تبصرے

اکیسویں صدی کے لیے نسخہ کیمیا

ڈاکٹر انور سدید

رفیق ڈوگر سے پہلی ملاقات ہو تو اس سے خوف آتا ہے، وہ مخاطب کی آنکھوں میں اس ہٹلرانہ انداز میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہے کہ ایک نا موسوم خوف خود بخود پیدا ہو جاتا اور سامنے والے شخص کو مغلوب کر دیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نے اپنے مخاطب کو متاثر کرنے کا یہ فاتحانہ اسلوب ''نوائے وقت'' کی رپورٹنگ کے دوران اس اخبار کے جرأت مند بانی حمید نظامی اور ان کے بعد نظریہ پاکستان کو اس اخبار کے ذریعے سے استحکام و اثبات دینے والے مدیر مجید نظامی صاحب سے اکتساب کیا اور بعد میں سیاسی شخصیات کے انٹرویوز لیتے وقت اتنا زیادہ استعمال کیا کہ یہ اس کی فطرت ثانیہ بن گیا۔ فلک بوس بانس کی طرح ایستادہ اور کبھی نہ جھکنے والے رفیق ڈوگر میں مجھے پچھلے دنوں اچانک یہ تبدیلی نظر آئی کہ وہ گھنے درخت کی شاخ ثمر دار کے طرح جھکا ہوا تھا۔ اس کی گفتگو میں ملائمت تھی، آنکھوں کی ہٹلرانہ تیر اندازی ختم ہو گئی تھی۔ اس کے برعکس زمین پر بچھ جانے اور محض ایک خاکی انسان ہونے کا احساس نمایاں تھا۔ تب مجھے یاد آیا کہ رفیق ڈوگر ایک عرصہ سے مطلع صحافت سے غائب تھا اس کے ایک ہم نشین نے بتایا کہ وہ اپنی خلوت میں محصور ہو کر ایک بڑا کام کر رہا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں رفیق ڈوگر کو کھیل، ثقافت، سیاست اور تحقیقاتی رپورٹنگ میں الجھا ہوا ایک ہوش مند صحافی شمار کرتا تھا۔ جرنیلوں کے متعلق اس کی ایک کتاب کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ اس نے اصلی ضیاء الحق کو بھی بڑی ہوشیاری سے بازیافت کیا تھا۔ مصر اور اندلس کے سفرناموں میں ایک زیرک صحافی کی تیکھی نظر شامل تھی لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں اس سے کسی بڑے کام کی توقع نہیں کرتا تھا لیکن اس روز جب میں نے سنگ خارا جیسی طبیعت رکھنے والے شخص کو ''رفیق ڈوگر'' کہہ کر بلایا تو اس اس نے دو ٹوک تصحیح کی کہ اب وہ ''محمد رفیق ڈوگر'' ہے، اس روز یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ اس کا ڈیڑھ دو سال کا غیاب دراصل وہ عرصہ تھا جو اس نے نبی اکرم ﷺ کی حضوری میں اپنی خلوت میں بیٹھ کر گزارا اور حضور ﷺ کی مکی اور مدنی زندگی پر تین ضخیم جلدوں میں ایک کتاب لکھی جو اب زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ چکی ہے۔

اس وقت مجھ پر واضح ہوا کہ رفیق ڈوگر کی کاروباری صحافت میں اب تقدس کا زاویہ شامل ہو گیا تھا اور بد نہاد سیاست دانوں کی کرپشن سے آلودہ زندگیوں کی تحقیقاتی رپورٹیں لکھتے وہ اس مقام پر پہنچ چکا تھا، جہاں اپنے باطن کی تحقیقات خود اپنا دل و دماغ کرنے لگتا ہے۔ محمد رفیق ڈوگر پر التفات نبوی ﷺ کی یہ عطا نیکی، ایک ایسے واقعے کی بھی مظہر ہے جس نے اسے موت کے دہانے پر پہنچا دیا تھا۔ وہ فروری ۱۹۹۱ء میں بائیں گھٹنے کا آپریشن کرانے کے لیے شیخ زید ہسپتال میں گیا تو ڈاکٹروں نے اسے کینسر میں مبتلا قرار

دے دیا اور ٹانگ کاٹ ڈالنے کی تجویز پیش کی کہ اس سے زندگی کے دس مزید سال مل سکتے تھے۔

وہ رپورٹ لے کر اپنے کمرے میں آیا تو اس ایقان سے معمور تھا کہ جو بیماری نازل کرتا ہے، وہ اللہ شفا بھی دیتا ہے۔ پھر خیال آیا کہ زندگی کی جو ساعتیں دستیاب ہیں، وہ کسی دنیوی کام میں کیوں صرف کی جائیں؟ بس یہی وہ لمحہ تھا جب رفیق ڈوگر پر اللہ کا کرم اور التفات نبوی ﷺ موسلا دھار بارش کی طرح برسنے لگا اور وہ اس کام میں مصروف ہو گیا جس کی تکمیل شبلی نعمانی کی زندگی بھر کی آرزو تھی لیکن جس کی دو جلدوں کے بعد تکمیل مولانا سید سلیمان ندوی نے کی۔ یہی وہ مرحلہ تھا جب صحافی رفیق ڈوگر سیرت نگار نبی ﷺ کی صورت میں سامنے آیا اور محمد رفیق ڈوگر کے نام سے موسوم ہوا۔ اس نے اعتراف کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی سیرت کی طرف مراجعت کینسر کا علاج بنتی چلی گئی اور جیسے جیسے مطالعہ اور سیرت نگاری کا کام آگے بڑھتا گیا، مرض رفع ہوتا گیا اور اب وہ حسب سابق صحت مند ہے لیکن اس کی زندگی کا دھارا بدل چکا ہے۔

محمد رفیق ڈوگر کی کتاب ''الامین ﷺ'' کی پہلی جلد میں نبی آخر ﷺ کی مکی زندگی کا پیش منظر اور تاریخی پس منظر پیش کیا گیا ہے اور معنوی طور پر اس بدوی مزاج کا تعین کیا گیا ہے جو مکے کے عوام کی رگ و پے میں سمایا ہوا تھا اور جس پر کفر کا غلبہ تھا۔ اس تاریخی احوال میں ولادت محمد ﷺ عرب کی سرزمین کا اہم ترین واقعہ ہے جس کی روشنی کا دائرہ وسیع کرنے اور مکہ کے منکرین اسلام کے دلوں کو تسخیر کرنے کے لیے آنحضرت نے مدینہ کی طرف ہجرت کی، دوسری جلد آپ ﷺ کی مدنی زندگی کا مرقع ہے اور اس میں رسول اللہ کی ہجرت سے رومیوں کو چیلنج دینے تک کے واقعات ہیں، تیسری جلد میں وفات تک کے حالات ہیں۔ پہلا دور تبلیغ اسلام کا اور دوسرا استحکام اسلام کا دور ہے جو حضور نے اپنی پیغمبرانہ فراست میں طے کیے۔ ان ادوار کے درمیان نبی معظم ﷺ کی عملی زندگی کا بیان ہے۔ جو گزشتہ چودہ سو برسوں کے دوران پوری دنیا کے لیے مشعل راہ ہے۔

محمد رفیق ڈوگر کی خوبی یہ ہے کہ اس نے سیرت کی متعدد کتابوں کو ماخذات کے طور پر استعمال کیا تو اس مطالعے نے اسے تاریخ و سیرت نگاری کے جدید تصورات کو استعمال کرنے کی راہ دکھائی اور اس نے نتائج کے نئے آفاق روشن کیے۔ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی تو سیرت نگاری کے سربلند مصنفین ہیں۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ ان کے بعد سیرت کی جتنی کتابیں لکھی گئیں ان کے لیے ان دو جلیل القدر محققین کی کتابیں روشنی کے مینار ثابت ہوئیں۔ ہماری بیشتر کتب سیرت، شبلی نعمانی اور سلیمان ندوی کی سیرت نگاری کی ہی زریں کرنیں ہیں۔ بعد کے مصنفین نے ان کرنوں سے روشنی لے کر اپنے اسلوب میں اپنی کتابوں کی تزئین کی ہے۔ محمد رفیق ڈوگر نے تجزیہ و تحلیل کے عمل کو اپنایا اور جہاں کہیں انہیں سابق سیرت نگاروں کے تجزیوں سے اپنے اختلاف کا زاویہ نظر آیا، اس کے اظہار میں تاخیر نہ کی۔ اس کتاب کے حواشی اور تعلیقات سے بھی نئی روشنی چھنتی اور کتاب کے موضوعات کو منور کرتی ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ محمد رفیق ڈوگر کی یہ کتاب دراصل تشکیک سے تصدیق بلکہ توثیق کی طرف سے ان کا اپنا فکری سفر ہے۔ یہ طب نبوی کا ایک آزمودہ نسخہ ہے۔ جو بدن کی بیماریوں کو دور کرتا اور روح کی طہارت کو پوری زندگی پر حائل کر دیتا ہے۔ دل صاف ہو تو یہ کتاب پڑھتے وقت حضوری ﷺ کی کیفیت بھی نصیب ہو جاتی ہے اور یہ کتاب نسخہ کیمیا ثابت ہوئی ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ محمد رفیق ڈوگر کو یہ سعادت یونہی نصیب نہیں ہوگی۔ یہ تو خدائے بخشندہ کی عطا ہے۔

حکایات جنوں

امجد اسلام امجد

عطیہ سید ہماری خاتون افسانہ نگاروں کی صف میں دیر سے شامل ہوئیں مگر جس تیزی سے وہ آگے بڑھ رہی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مستقبل قریب میں ان کا شمار اردو کے بہترین کہانی کاروں میں ہونے لگے گا، ان کے افسانوں کا تازہ تر مجموعہ ''حکایات جنوں'' یقیناً ان کے فنی سفر کا ایک ایسا پڑاؤ ہے جس سے آگے ''غیر معمولی'' کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں۔

ان پندرہ کہانیوں میں مختصر کہانیاں بھی ہیں اور طویل و مختصر بھی۔ سب سے لمبی کہانی ''دائرہ'' ہے جو افلاطونی نما عشق کی ایک عجیب و غریب داستان ہے جو ایک مشہور غزل ''اے ترک غمزہ زن کہ مقابل نشستہ ای'' کے حوالے سے شروع ہوتی ہے اور پھر کہانی کے ہیرو گولاہور کے اندرون شہر کی ایک حویلی سے نکال کر استنبول، انقرہ اور قونیا کی فضاؤں میں لے جاتی ہے۔ کہانی کی ہیروئن فریدے سے ہمارے ہیرو کے تعارف کا سین جدید ہونے کے باوجود اپنے اندر ایک داستانوی اپیل اور ماحول رکھتا ہے۔ عطیہ سید لکھتی ہیں:

''عین اسی وقت ترک خاتون نے اپنی جھکی ہوئی آنکھیں اوپر اٹھائیں اور ایک شناسا سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔۔اے ترک غمزہ زن.....

میرے کانوں میں مغنی خوش نوا کی آواز لہرائی یہ وہی آنکھیں تھیں میں جن کی جستجو میں گزشتہ کئی ماہ سے سرگرداں تھا۔ مجھے برقی جھٹکا سا لگا اور ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ میں تیز ہواؤں کی زد میں تھا مجھے کائنات کے کسی گوشے سے آواز آئی، گھوم۔۔گھوم۔۔گھوم۔۔پھر مجھے لبادوں کے پھڑ پھڑانے کی صدا آئی میرے پاؤں زمین سے اکھڑنے لگے میں ہوا کے دوش پر بلند ہوا اور لٹو کی طرح تیزی سے چکر کھانے لگا۔

..... میں وہاں صوفے پر نیم دراز، نقاہت کے خمار سے دوچار، تخیل آرزو سے نیم جاں، لیکن مسرور تھا اگرچہ میں شہزادہ گلفام کی مانند پری کے دیدار سے بے ہوش ہو گیا تھا اور شاید میرا یہ عمل روایتی گھسی پٹی عشقیہ داستانوں کے کرداروں کی طرح مضحکہ خیز تھا۔۔۔ مجھے اس کی رتی بھر پروانہ تھی۔ میں مخمور تھا، سامنے ان نرم گرم جذبے سے چھلکتی چمک دار آنکھوں کے نظارے سے مسحور تھا۔ میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے لوگوں کی چنداں فکر نہ تھی ورنہ تمام عمر اسی اندیشے میں کٹی تھی کہ بھلا لوگ میرے بارے میں کیا سوچیں گے''۔

اقتباس قدرے طویل ہو گیا ہے مگر اس کے بغیر وہ بات واضح نہیں ہو سکتی تھی جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ اس کہانی میں ماضی اور حال کس طرح آپس میں یکجان ہو گئے ہیں۔ اس مجموعے کی اگلی دو کامیاب ترین کہانیاں بھی نسبتاً طویل

کہانیاں ہیں۔ میری مراد ''جلوہ'' اور ''فریب آرزو'' سے ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے عطیہ سید کا اصل جوہر طویل مختصر کہانیوں میں ہی کھلتا ہے جہاں وہ مختلف طرح کی جزئیات کے بیان سے ایک ایسا ماحول پیدا کرتی ہیں جس میں کہانی آہستہ آہستہ کھلتی چلی جاتی ہے۔ عطیہ سید کی کہانیوں میں اردگرد کی دنیا کے ساتھ ساتھ ایک ان بنی دنیا یا تصوراتی دنیا بھی قدم قدم چلتی نظر آتی ہے کبھی کبھی وہ ایک عام سے Locale میں کسی اچھوتی کہانی کی دریافت کر لیتی ہیں اور قاری ایک معمول کی طرح کہانی اور کہانی کار کی گرفت میں حیران و ششدر رہ جاتا ہے۔ ان کی کہانی ''جلوہ'' ایک ایسی ہی انوکھی کہانی ہے جس میں دو پاکستانی کردار اٹلی کے ایک غیر آباد علاقے میں ایک راہب کی خانقاہ تک پہنچتے ہیں اور ایک ایسی کہانی کے بقیہ حصوں کو جمع کرتے ہیں جو 1547ء میں شروع ہوئی تھی اور جس میں اس وقت کے پوپ نے ایک پادری برادر کلیمنٹ سے اس کی روحانی واردات کے بارے میں ایک ناقابل یقین مگر خود بیتی واردات سنی تھی جسے دنیا کی نظروں سے اوجھل رکھنے کے لیے اس نے ایک خصوصی اہتمام کیا تھا۔ یہ کہانی اپنے ٹریٹ منٹ، جزئیات اور انداز بیان کے باعث اپنے اندر ایک غیر معمولی کشش رکھتی ہے کہ آپ اسے پڑھتے پڑھتے خود بھی اس کا حصہ بن جاتے ہیں۔

یوں تو عطیہ سید کی ہر کہانی خصوصی توجہ کی طالب ہے کہ یہ اردو افسانے میں کہانی کے عنصر کی بار دیگر شمولیت کی ترجمان ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں کہانیاں اس براہ راست انداز میں پیش نہیں کی گئیں جیسی کہ اردو افسانے کے زریں دور یعنی 1940 سے 1960 تک میں بیان کی جاتی تھیں۔ عطیہ کے یہاں واقعہ نگاری کے ساتھ ساتھ ایک علامتی انداز بھی عمل پیرا نظر آتا ہے۔ بہت سی کہانیاں بظاہر کسی واضح انجام کے بغیر ختم ہو جاتی ہیں یا کہانی کے مرکزی کردار کی ذہنی اور روحانی کیفیات کے ایک خاص عالم میں منتج ہوتی ہیں۔ جسے ایک سے زیادہ نام دیئے جا سکتے ہیں۔

کہیں کہیں ان کہانیوں میں تشنگی کا احساس بھی ہوتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے کہانی ابھی باقی تھی مگر مصنفہ نے کلائمکس کے ایک خاص نقطے کو پسند کرنے کی وجہ سے اس کا وہیں انجام کر دیا ہے۔

مجموعی طور پر یہ ''حکایات جنوں'' ہمارے اردگرد بکھری ہوئی زندگی اور کرداروں کی کہانیاں ہیں جن کا ایک سرا روایت میں اور دوسرا ہمارے زمانہ حال میں ہے۔ میں اتنی عمدہ کہانیاں لکھنے پر عطیہ سید کو مبارک دیتا ہوں کہ وہ ان کہانی کاروں میں شامل ہو گئی ہے جن کے دم سے اردو افسانے کا مستقبل تابناک ہے۔

میر عبدالعزیز، فریڈم سٹرگل ان کشمیر (انگریزی)

ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی

مشہور صحافی میر عبدالعزیز مرحوم پیدائشی کشمیری تھے۔ سری نگر میں ان کی ولادت ہوئی اور اسی شہر کے اے۔ ایس۔ ڈی کالج سے انہوں نے گریجوایشن کی۔ ایک حساس اور محب وطن کشمیری ہونے کے ناتے وہ وادی پر ڈوگرہ راج کی لعنت اور اس کے نتیجے میں بے گناہ و معصوم کشمیری مسلمانوں پر ہونے والے بے پناہ ظلم و ستم کو دیکھتے اور اس کا بغور جائزہ لیتے رہے۔ وہاں انہوں

نے ڈوگرہ راج کے خلاف اور حصول آزادی کی خاطر کشمیریوں کی جدوجہد کے واقعات بھی دیکھے۔ ایک حساس دل پر ایسے واقعات کا جو اثر ہو سکتا ہے وہ ''اظہر من الشمس'' ہے۔ تقسیم ملک کے بعد وہ پاکستان ہجرت کر آئے اور راولپنڈی میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گئے۔ یہاں انہوں نے ڈوگرہ راج اور کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کرنے والے بھارت کے خلاف کشمیریوں کی جنگ آزادی کے ضمن میں اپنی زندگی، تحریری اور تقریری طور پر، اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے وقف کر دی۔ اس سلسلے میں انہوں نے کئی ملکوں فرانس، انگلستان، رومانیہ، تاجکستان اور ازبکستان کے دورے کیے اور وہاں کئی شہری سیمیناروں اور استقبالیہ وغیرہ میں تقریریں کیں۔ کتاب زیر تبصرہ ان کے ایسے بعض مضامین کا مجموعہ اور ان کے ٹھوس جذبوں کی بھرپور عکاس ہے۔ اس میں انہوں نے کہیں بھی جذباتی انداز سے کام نہیں لیا بلکہ حقائق کو صحیح صورت اور دلیرانہ انداز میں مختلف حوالوں سے پیش کیا ہے جس کی وجہ سے کتاب آزادی کشمیر کے سلسلے میں ایک مستند ماخذ کی صورت اختیار کر گئی ہے۔

کتاب زیر تبصرہ دیباچہ کے علاوہ دس ابواب پر مشتمل ہے۔ اور آخر میں حواشی و تعلیقات، کتابیات، گیارہ ضمیمہ جات انگریزی میں اور دو اردو میں، نیز اشاریہ کی تفصیل آ گئی ہے۔ دیباچہ میں ڈائریکٹر ریسرچ سوسائٹی جناب پروفیسر ڈاکٹر عبدالشکور احسن صاحب نے ادارۂ مذکور کی طرف سے مؤلف سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کا ذکر کر کے اس بات پر اظہار تاسف کیا ہے کہ کتاب کے منصۂ شہود پر آنے سے قبل ہی مؤلف دارِ فانی سے عالم بقا کو سدھار گئے۔ انہوں نے میر عبدالعزیز مرحوم کے مختصر حالات زندگی بھی دیے ہیں، جن میں ان کی کشمیر سے متعلق مختلف تعمیری سرگرمیوں کا بھی ذکر آ گیا ہے۔ یہ دیباچہ گو دو صفحات کو محیط ہے لیکن ایک ایسے پس منظر کی حیثیت رکھتا ہے جس سے قاری، کتاب کے مبنی برحقایق ہونے اور اس کے استناد کو بخوبی جان اور سمجھ لیتا ہے۔

پہلے باب میں گیارہ ذیلی عنوانات آ گئے ہیں، جن میں تاریخی حوالوں سے قدیم اور مختلف ادوار میں کشمیر کی صورت حال پر روشنی ڈالی گئی اور ''مسئلہ کشمیر'' کو بھارت کا پیدا کردہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔ چند عنوانات ملاحظہ ہوں: ''قبل از آریا کے ناگا''، اس میں بتایا گیا ہے کہ اس وادی میں پہلے آباد کار ناگا تھے اور موجودہ کشمیری زبان دراصل ان کی زبان تھی۔ (ص ۶) ''کشمیر، کشیاپ رشی کی سرزمین''، اس میں لفظ کشمیر یا کاشمیر کی وضاحت ہے۔ اس کا مطلب ہے سرزمین کشیاپ۔ یہ ایک روحانی رہنما تھے جنہوں نے اپنی کرامت سے اس وادی کو ایک بڑی جھیل کی جگہ زرخیز زمین بنا دیا۔ (ص ۹)۔ اگر فاضل مؤلف اس حصے کو شروع میں لاتے تو مناسب ہوتا کہ یہ ایک طرح کا تعارف تھا جو آغاز میں ہوتا۔ ''ایک آفاقی شہرت کی حامل سرزمین''۔ ''طبقات الارضی دور اور کشمیر''، اس میں ایک مؤرخ ایم۔ بی پیتھاوالا کی ''حیرت انگیز'' کتاب کے حوالے سے سرزمین کشمیر کی عمر کوئی ۱۰۰ ملین (۱۰ کروڑ) برس بتائی گئی ہے (ص ۱۳)۔ اس بے حد چونکا دینے والی عمر کا اندازہ مؤرخ کو کیسے ہوا؟ یہ سوال قاری کے ذہن کو مخمصے میں ڈالتا ہے۔ ''کشمیر کا خالصتاً مسلم دور'' اور اسی طرح دیگر عنوانات کے تحت کشمیر کی دلچسپ تاریخ بیان ہوئی ہے۔ مؤلف اس حصے میں علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے حوالے بھی لائے ہیں۔ دوسرے باب میں آٹھ عنوانات ہیں۔ پہلا عنوان معاہدہ امرتسر سے متعلق ہے، جس کے تحت کشمیر، گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کیا گیا۔ راقم (یزدانی) نے ''لاہور ریکارڈ آفس کی چند اہم دستاویزات'' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا تھا جو رسالہ نقوش کے ''لاہور نمبر'' کے بعد کے شمارے میں شائع ہوا۔ بعد میں یہ کتابی

صورت میں بعنوان ''کشمیر کی فروخت''، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا۔ اس تمہید سے مقصود یہ ہے کہ یہ معاہدہ اصل صورت میں ریکارڈ آفس (سول سیکرٹریٹ لاہور) میں موجود ہے۔ یہ معاہدہ اصلاً فارسی زبان میں ہے اور اس کے ساتھ اس کا انگریزی ترجمہ ہے۔ یہ معاہدہ مارچ ۱۸۴۸ء میں ہوا۔ ''ڈوگرہ راج میں مسلمانوں کی حالت زار'' میں، جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، اس حالت زار کی دل دوز عکاسی اور مسلمانوں کے احتجاجات کی کسی قدر تفصیل ہے۔ مثلاً مسلمان، بطور جماعت کے، دنیاوی تعلیم سے محروم رکھے گئے، نہ ان میں اس کا جذبہ پیدا ہونے دیا اور نہ ہندو حکمران کی حکومت میں انہیں ملازمتیں ملیں (ص ۶۸، نیز ص ۷۷) پھر مہاراجا گلاب سنگھ کے نام گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگز کے خط کا متن ہے، جو اس نے یورپ واپس جاتے ہوئے لکھا اور کشمیریوں کی حالت زار پر اظہار تاسف و پریشانی کیا تھا۔ (ص ۷۰۔۷۱) میر مرحوم نے موقع کے مطابق منشی محمد دین فوق (مرحوم) اور مولانا ظفر علی خان مرحوم کے یہ دو اشعار (رومن حروف میں) لکھ کر شعر و ادب سے متعلق اپنی دلچسپی کی غمازی کی ہے۔ ان میں ہندو کی مسلم دشمنی اور انگریز کی بے مہری کا مضمون ہے (ص ۶۸۔۶۹):

کیوں سو مناتھ رکھے اس کو بھلا ملازم
عرضی میں نام لکھا ''محمود'' جس نے اپنا

حکمراں بے مہر ہے اور بے نیاز اس کا وزیر
شکوہ کس سے کیجیے پھوٹی ہوئی تقدیر کا

''برطانوی ہند کے مسلمانوں کی تشویش'' کے تحت آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے حوالے سے اس تشویش کی تفصیل ہے جس میں مذکورہ کانفرنس کی جانب سے مہاراجا کشمیر کی توجہ مسلمانوں کی ناخواندگی کی طرف دلائی گئی ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں علامہ اقبال نے چند اہم شخصیات کے ہمراہ مہاراجا سے ملاقات کر کے اس امر پر زور دیا کہ وہ مسلمانوں کی تعلیم و خواندگی کا اہتمام کرے، لیکن اس ظالم کے سر پر گویا جوں تک نہ رینگی (ص ۸۰)۔

تیسرا باب پانچ اور چوتھا باب تیرہ ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے۔ ان میں سلک فیکٹری کا حادثہ، تحریک آزادی کشمیر کا آغاز، وزیراعظم ویکفیلڈ کی برطرفی، جموں اور کشمیر میں مسلمانوں کی پہلی پارٹی کی تشکیل، کشمیر میں تحریک پاکستان اور دوسرے موضوعات آ گئے ہیں۔ پانچواں گیارہ عنوانات کو محیط ہے۔ اس میں ''قائداعظم کی کشمیر کی طرف آخری مسافت''، ''نہرو اینڈ کمپنی کے خلاف تاریخی احتجاجات''، ''مسلمان طلبا کی سرگرمیوں کا جائزہ''، تحریک ''کشمیر چھوڑ دو''، ''قائداعظم کا طلبا کو جواب''، ''ہوم منسٹر کا منحوس گشتی مراسلہ'' اور ''انتخابات میں مسلم لیگ کی بھاری اکثریت'' ایسے موضوع آ گئے ہیں۔ مذکورہ گشتی مراسلہ موسم بہار ۱۹۴۵ء میں جاری ہوا، جس کے مطابق سکولوں کالجوں میں سیاسی طور پر متحرک طلبا یونینوں پر پابندی لگائی گئی (ص ۱۷۶۔۱۷۷) ظاہر ہے اس کا مقصد صرف مسلمان طلبا کو باز رکھنا اور کچلنا تھا۔ مسلمان طلبا نے احتجاج کی صورت میں ۱۲ مئی ۱۹۴۵ء کو پریس میں ایک بیان دیا جس میں اس حکم کی تنسیخ کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ جنرل سیکرٹری مسلم سٹوڈنٹس یونین نے ریاست سے باہر لاہور اور علی گڑھ کی مسلم سٹوڈنٹس یونینوں کو بھی اس ضمن میں سرکلر بھیجا لیکن سب کوششیں بے اثر ثابت ہوئیں (ص ۱۷۶)۔ واضح ہے کہ حیوان صفت حکمران کا بنیادی مقصد ہی مسلمانوں کی ہر طرح کی آزادی کو کچلنا تھا۔ ویسے بھی ہندو سے خیر کی توقع رکھنا ہماری بے خبری بلکہ کم عقلی ہوگی۔

چھٹے باب میں نو، ساتویں میں چودہ، آٹھویں میں سولہ، نویں میں گیارہ اور دسویں میں تیرہ ذیلی عنوانات ہیں۔ ان سب ابواب میں کہیں آنجہانی گاندھی کے گھٹیا کردار، عبداللہ جہنمی کی غداری و دغابازی، کشمیر کی تباہی میں برطانیہ کا ہاتھ، ماؤنٹ بیٹن کی ہندونوازی اہل جموں وکشمیر کی طرف سے پہلی مرتبہ آزادی کا اعلان، جب قائد کی نافرمانی کی گئی، کشمیر میں قبائلی، مجاہدین سرینگر ہوائی اڈے پر قابض کیوں نہ ہو سکے۔ اس عنوان کے تحت مؤلف نے ۳۵ برس بعد ۱۹۸۲ء میں اپنے وطن سرینگر جانے اور ہوائی اڈے کے قریب رہنے والے اپنے ایک دوست کے حوالے سے اس کی وجوہات بتائی ہیں۔ ممکن ہے وہ درست ہوں تاہم راقم (یزدانی) کو آنجہانی نہرو کے اس بیان کا، جو اس نے ہند اسمبلی میں دیا تھا، ایک ٹکڑا یاد ہے جس کے مطابق اس نے اعتراف کیا تھا کہ مجاہدین سرینگر کے ہوائی اڈے پر قابض ہونے والے تھے۔ دراصل بھارت نے، حسب معمول چال چل کر اس موقع پر اقوام متحدہ سے (جسے علامہ کے لفظوں میں ''کفن دزدے چند'' کی مجلس کہنا صحیح ہے۔ فوری رجوع کر کے جنگ بندی کروادی تھی جسے ہمارے ''عالی مرتبہ'' رہنماؤں نے قبول کر لیا تھا۔ ہمارے ان مہربانوں کی وقتی لغزش کے نتیجے میں ملت اسلامیہ کشمیر آج تک ذلت، ظلم واذیت اور تباہی کا شکار تو ہے ہی لیکن خود اپنا وطن عزیز بھی، مختلف صورتوں میں، اس کی سزا بھگت رہا ہے۔ گویا پاکستان کی اس ایک لمحے کی غفلت نے آزادی کشمیر کو کوسوں دور کر دیا۔ ایرانی شاعر ملک قمی کے بقول:

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہان شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ را ہم دور شد

خدائے بزرگ وبرتر پاکستان کو ایسے مخلص، دیانتدار اور دلیر رہنما عطا فرمائے جو ملک وملت کی صحیح معنوں میں تعمیری خدمت کر سکیں اور ہم دنیا میں سرخروئی اور عزت ووقار کی زندگی بسر کر سکیں:

این دعا از من واز جملہ جہان آمین باد

''تحریک آزادی کشمیر۔۔سنگہائے میل'' میں فاضل مؤلف نے ایک تو اس بات کی تردید کی ہے کہ اس تحریک کا آغاز ۱۹۸۸ء میں ہوا یا یہ کہ اکتوبر ۱۹۴۷ء سے یہ جاری ہے جب بھارت حملہ کر کے کشمیر پر قابض ہوا بلکہ جدید اصطلاحی معنوں میں یہ تحریک ۱۹۳۱ء میں شروع ہوئی۔ دوسرے یہ کہ تاریخ کا بغور جائزہ لینے سے پتا چلتا ہے کہ درحقیقت ۱۸۱۹ء میں مہاراجا رنجیت سنگھ کے حملے کے بعد کشمیر میں مسلمانوں کی غلامی کا آغاز ہوا (ص ۴۳۸)۔ مذکورہ غلامی کا تذکرہ مؤلف نے آگے چل کر ''جہاد کشمیر کسی کمی کے بغیر جاری ہے'' میں پھر کیا ہے (ص ۴۶۳)۔

غرضیکہ ان ابواب میں مختلف حوالوں اور عنوانات کے تحت تاریخ کشمیر اور جہاد کشمیر پر تفصیلی بات ہوئی ہے۔ حواشی وتعلیقات محنت سے تیار کیے گئے ہیں۔ دو اردو ضمیمہ جات ''قرارداد الحاق'' (ص ۵۲۷) اور ''قرارداد آزاد کشمیر'' (ص ۵۳۷) خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔

کتاب ریسرچ سوسائٹی جیسے مؤقر ادارہ نے شائع کی ہے جو صرف اہم، مستند اور حوالے کی کتب کی نشر واشاعت کے لیے مشہور ہے۔ ایک تو اس ادارے کے حوالے سے، دوسرے خود مولف نے جس ٹھوس محققانہ انداز میں یہ کتاب ترتیب دی ہے، اس سے کشمیر اور تحریک آزادی کشمیر کے بارے میں بہت مفید مواد نہ صرف مستقبل کے مورخین ومحققین کے لیے جمع ہو گیا ہے بلکہ آج بھی اس کی اہمیت وافادیت میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ ادارۂ مذکور نے یہ مفید کتاب شائع کر کے بہت بڑی قومی خدمت انجام دی ہے،

جس کے لیے وہ لائق مبارک باد وتحسین ہے اور خدائے بزرگ وبرتر مرحوم مؤلف کو اپنے جوار رحمت میں جگہ سے نوازے جنہوں نے یہ اہم کارنامہ انجام دیا۔ آمین۔

سہ ماہی ''انشا'' (ڈاکٹر نجم الاسلام نمبر: حصہ اول) حیدرآباد

محمد سعید

رفیق احمد خاں اور عتیق احمد جیلانی کی ادارت میں نکلنے والا تحقیقی وتنقیدی مجلہ سہ ماہی ''انشا'' (حیدرآباد) اپنے مزاج اور معیار کے لحاظ سے اردو رسائل میں اپنی نوعیت کا منفرد رسالہ ہے۔ جس نے بہت جلد اپنی جگہ بنالی ہے۔ اس کا تازہ شمارہ ''ڈاکٹر نجم الاسلام نمبر (حصہ اول)، ڈاکٹر صاحب کی خدمات کے اعتراف میں مارچ ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا ہے۔ یہ شمارہ ایک تحقیقی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر نجم الاسلام نے ۱۳ فروری ۲۰۰۱ء کو انتقال فرمایا، ان کو خراج عقیدت پیش کرنے اور انہیں یاد رکھنے کے لیے اس شمارہ خاص کی اشاعت، قابل تقلید روایت کا حصہ ہے۔

۳۲۰ صفحات پر پھیلا ہوا یہ شمارہ، اپنے مندرجات کے لحاظ سے تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں مختلف اہل قلم اور ڈاکٹر نجم الاسلام کے احباب وتلامذہ کے ۲۸ تاثراتی، تحقیقی وتنقیدی مضامین اور شخصی خاکے شامل ہیں۔ جو صفحہ ۱۹ سے ۱۷۹ تک ہیں۔ اس حصے کا پہلا مضمون ''ڈاکٹر نجم الاسلام (مرحوم)'' از ڈاکٹر مختار الدین احمد اور آخری مضمون ''ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے ایک نامور شاگرد'' از نازنین سلیم، ڈاکٹر صاحب کے سوانحی حالات اور ان کی تصانیف کے تعارف وتذکرے کے سلسلے میں اہم ہیں۔ ان دونوں مضامین میں ڈاکٹر نجم الاسلام کے ابتدائی حالات، ان کی تصانیف، غیر مدون مقالات، تراجم، تبصرے اور ان کی نگرانی میں لکھے جانے والے سندی مقالات وغیرہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہاں چند ایک فروگزاشتوں کا احساس ہوتا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر مختار الدین احمد لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر نجم الاسلام ''۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۹ء تک ایک اردو ماہنامہ ''معیار'' (میرٹھ) سے بحیثیت مدیر وابستہ رہے'' (ص ۱۹)۔ ڈاکٹر صاحب ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۶ء تک مذکورہ رسالے کے مدیر رہے ہوں گے کیونکہ ۱۹۵۶ء میں وہ پاکستان آ چکے تھے۔ یہ سہو اردو ہندسوں کی کتابت کے الٹ پھیر کا شاخسانہ معلوم ہوتا ہے۔ نازنین سلیم نے ڈاکٹر صاحب کی رینائرمنٹ کی تاریخ ۳۰ جون ۱۹۹۲ء درج کی ہے (ص ۱۶۴) جبکہ وہ ۳۰ جون ۱۹۹۳ء کو (بطور صدر شعبہ اردو، جامعہ سندھ) ریٹائر ہوئے۔ یہاں بھی تین اور دو کے مابین ایک شوشے کا پھیر دکھائی دیتا ہے۔ بارہ مقالات پر مشتمل ڈاکٹر نجم الاسلام کی کتاب ''مطالعات'' ادارہ اردو، حیدرآباد سے نومبر ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد نے اس کتاب کے گیارہ مقالات گنوائے ہیں اور پہلے مقالے ''تین نثری نوادر'' کو بھی الگ الگ تین مقالات بتایا ہے جبکہ یہ ایک ہی مقالہ ہے جس میں شمالی ہند کی تین اردو تصانیف کا تعارف کرایا گیا ہے۔ ''مطالعات'' کا چوتھا مقالہ ''گربہ نامہ اور اس کا مصنف''، ڈاکٹر مختار الدین کے مضمون میں چھٹے نمبر پر ''گوہر نامہ'' ہو گیا ہے۔ مقالہ نمبر گیارہ ''غرۃ الکمال کے دو قلمی نسخے'' ہے۔ نازنین سلیم کے مضمون میں ص ۱۷۱ اور ۱۷۵ پر یہ سہو ''غرۃ الکمال'' چھپ گیا ہے۔ ڈاکٹر نجم الاسلام کی دیگر تصانیف کے سنین اشاعت کے بارے میں بھی ہر دو مضامین

میں اختلاف ہے اور شاید کچھ کتب کا تعارف شامل ہونے سے رہ بھی گیا ہو۔ مزید یہ کہ کچھ معلومات ڈاکٹر نجم الاسلام کی معتبر اور اضافی ہیں اور کچھ نازنین سلیم کی۔ کیا ہی اچھا ہوا گر ''انشاء'' کے ڈاکٹر نجم الاسلام نمبر (حصہ دوم) میں ان دو مضامین کی معلومات کو یکجا کر کے اور اس میں مکمل اور جامع و مانع اضافے کر کے ایک ''اشاریہ نمائے ڈاکٹر نجم الاسلام'' مرتب کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں ایک سفارش اور گزارش یہ بھی کی جاتی ہے کہ ''تحقیق'' جو ڈاکٹر صاحب کا ایک خاص کارنامہ ہے اس کے تمام شمارے اپنے مواد اور معیار کے لحاظ سے کسی مرتبہ کتاب سے کم نہیں۔ انہیں بھی ڈاکٹر صاحب کی تالیفات و مرتبات میں شامل کر لیا جائے۔ نیز ان کے غیر مدون اور غیر مطبوعہ مقالات کی حتمی فہرست بھی تیار کرنی چاہیے۔ یہ تحقیق اور تلاش حیدر آباد کے کسی اسکالر کے لیے مشکل کام تو ہو سکتا ہے ناممکن نہیں ہے۔

ڈاکٹر نجم الاسلام کی شخصیت اور مزاج کو اور بحیثیت مدیر انہیں سمجھنے کے لیے، ڈاکٹر الیاس عشقی کا پر مغز مضمون ''ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب سے چند ملاقاتیں'' (ص ۳۳۔۵۲) نہایت اہم ہے۔ یہ مضمون ڈاکٹر صاحب کی شخصیت سے متعلق کچھ سوالات پیدا کر کے ناقدین اور محققین کو دعوت تحقیق دیتا ہے۔ ممکن ہے ڈاکٹر الیاس عشقی کی کچھ باتیں محل نظر بھی ہوں۔ شخصی خاکوں میں پروفیسر رونق افروز کا ''عزت تھی جن کی چھاؤں.....'' اور عتیق محمد میو کا ''علم کا خزانہ، مہربانی ہستی'' بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق و تنقید اور تراجم سے متعلق بھی متعدد اہم مضامین اس پہلے باب کی زینت ہیں۔

ڈاکٹر عارف نوشاہی کے مضمون ''ڈاکٹر نجم الاسلام کے خطوط عارف نوشاہی کے نام'' اور ڈاکٹر ' اہد منیر عامر کے ''ڈاکٹر نجم الاسلام کے خطوط بنام زاہد منیر عامر'' سے گمان گزرتا ہے کہ شاید ان مضامین کے ساتھ خطوط بھی شامل ہیں۔ یہاں صرف مکتوب الیہم نے اپنے نام ڈاکٹر صاحب کے خطوط کا تعارف کرایا ہے۔ خطوط دوسرے باب میں دیکھنے چاہئیں۔ اسی طرح ڈاکٹر مختار الدین احمد، ڈاکٹر سردار احمد خان اور ابوسفیان اصلاحی کے نام ڈاکٹر صاحب کے خطوط ان مقالہ نگاروں کے مضامین کا حصہ ہیں۔ ان صاحبان کے نام خطوط کو باب دوم میں نہیں تلاش کرنا چاہیے۔ ''تاثرات'' (ص ۱۵۵۔۱۶۰) کے تحت۔ رفیق احمد خان نے ڈاکٹر نجم الاسلام کی وفات پر، اپنے نام یا دوسروں کے نام لکھے گئے تعزیتی خطوط کے اقتباسات کو ترتیب دے کر محفوظ کر لیا ہے۔ ان میں سے ''باوجود اختصار کے بعض تاثرات مکمل مضمون کا سا لطف دیتے ہیں''۔

باب دوم (ص ۱۸۱۔۲۴۴) ''مکتوبات'' پر مشتمل ہے۔ اس کے پہلے حصے ''مکتوبات ڈاکٹر نجم الاسلام'' میں ۲۴ مکتوب الیہم کے نام ڈاکٹر صاحب کے ۳۸ خطوط شامل ہیں۔ دوسرے حصے ''مکتوبات بنام ڈاکٹر نجم الاسلام'' کے تحت ۱۸ مکتوب نگاران کے ۲۲ خطوط ہیں۔ ان خطوط کی ترتیب اور تعارف بھی جناب رفیق احمد خاں کے حصے میں آیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ''ڈاکٹر نجم الاسلام کے خطوط اور ان کے نام خطوط کا ایک وقیع ذخیرہ جمع کر چکے ہیں۔ جو مناسب حواشی، ضروری تصریحات اور مکتوب نگاران کے سوانحی کوائف کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کیے جائیں گے''۔ خدا انہیں اس کار خیر میں جلد کامران ٹھہرائے۔ نمونے کے طور پر اس شمارے میں جگہ پانے والے ہر دو طرف سے لکھے گئے خطوط پر تکلف اور علمی و ادبی موضوعات پر ہیں۔ تحقیقی اعتبار سے ان خطوط کی ایک بڑی اہمیت یہ بھی ہے کہ ان سب کے عکس پیش کیے گئے ہیں۔

تیسرے باب میں عتیق احمد جیلانی صاحب نے، سندھ یونیورسٹی جامشورو کے شعبہ اردو سے، ڈاکٹر نجم الاسلام کی

ادارت میں نکلنے والے تحقیقی رسالے ''تحقیق'' کا جائزہ پیش کیا ہے۔ جو رسالہ ''تحقیق'' کے اشاریے اور اس کے اب تک کے تمام شماروں پر متعدد مطبوعہ تبصروں پر مشتمل ہے۔

''اشاریہ تحقیق''، ''انشا'' کے زیر تبصرہ شمارے کا خاص امتیاز اور بیش بہا تحقیقی افادیت کا حامل حصہ ہے جو ''تحقیق'' کے پہلے شمارے سے ڈاکٹر نجم الاسلام کی زندگی کے آخری متذکرہ شمارے ۱۲۔۱۳ کے مشمولات کی نشاندہی پر مشتمل ہے۔ مصنفین کے الف بائی ترتیب کے ساتھ پہلے ''مقالات'' پھر ''مکتوبات'' اور آخر میں ''تبصروں'' کا اشاریہ ہے۔ چند تسامحات اس حصے میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ''تحقیق کے مشترکہ شمارہ ۸۔۹ کے ''گوشہء اختر'' کو دیکھیں تو دو مشمولات اس اشاریے میں درج ہونے سے رہ گئے ہیں۔ مثلاً ''مکاتیب قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی'' مرتبہ مختار الدین احمد (ص ۴۷۔۹۴) مختار الدین احمد نے یہاں، سات مکتوب الیہم کے تعارف اور حواشی کے ساتھ ان کے نام میاں اختر کے ۳۸ خطوط متعارف کرائے ہیں۔ اس طرح ''مکتوبات مشاہیر بنام اختر'' (مخزونہ کتاب خانہ مشفق خواجہ (ص ۱۴۷۔۱۸۱)

یہاں گیارہ مکتوب نگاران کے ۴۵ خطوط بنام میاں اختر شامل ہیں۔ لیکن زیر تبصرہ رسالہ ''انشا'' میں شامل ''اشاریہ تحقیق'' میں تفصیل سے قطع نظر یہ دو عنوانات بھی درج ہونے سے رہ گئے ہیں۔ پھر یہ کہ اسی شمارہ ۸۔۹ میں اضافات کے تحت (ص ۵۲۹) سید انیس شاہ جیلانی نے میاں اختر کے دو مکتوب ''بنام حیرت'' متعارف کروائے ہیں۔ اشاریے میں ان کا ذکر ''مکتوبات'' کی بجائے ''مقالات'' کے تحت درج ہو گیا ہے۔

''تحقیق'' کے شمارہ نمبر ۳ میں راشد برہان پوری کی اپنے ذخیرہ سے متعلق تحریر کردہ فہرست مخطوطات شامل ہے جسے محمد شفیع بروہی نے نظر ثانی کے بعد شائع کیا ہے۔ ''اشاریے'' میں ان دونوں صاحبان کے نام سے ''مخطوطات ذخیرۂ راشد برہان پوری (مخزونہ مرکزی کتاب خانہ جامعہ سندھ)'' درج ہو گیا ہے۔ جس سے التباس پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ''تحقیق'' کے ''اداریے'' اور ''اخذ و استفادہ'' کے تحت آنے والی تحریریں بھی حوالے کی ہوتی ہیں۔ ''اشاریے'' میں ان کا ذکر بھی رہ گیا ہے۔ تحقیق کے دیگر شماروں کے سلسلے میں بھی چند ایک جگہوں پر اس اشاریے میں ایسی کمی کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن جتنا کچھ، جس سلیقے اور طریقے سے درج ہوا ہے، عام استفادے کے لیے وہ قابل قدر ہے۔

محقق، ناقد، مترجم اور مدیر کی حیثیت سے ڈاکٹر نجم الاسلام کو موضوع بنانے والے کسی اسکالر کے لیے ''انشاء'' کے اس خاص شمارے سے صرف نظر ممکن نہیں۔ امید کی جانی چاہیے کہ اس کا اگلا شمارہ (ڈاکٹر نجم الاسلام حصہ دوم) بھی صوری و معنوی خوبیوں کے ساتھ قارئین کی ضیافت طبع کا سروسامان فراہم کرے گا۔

ناشرین سے التماس

مخزن میں تبصرے کے لیے کتاب کے دو نسخے روانہ کیے جائیں

مدیر

ایک لڑکی بگھارتی ہے دال

کرشن چندر

ایک لڑکی بگھارتی ہے دال۔ اسمٰعیل میرٹھی نے کہا ہے۔ مگر یہ قصہ پرانے زمانے کا ہے جب لڑکیاں واقعی دال بگھارتی تھیں آج کل تو وہ صرف شیخی بگھارتی ہیں۔

کہتے ہیں پرانے زمانے میں دال اتنی سستی ہوتی تھی کہ نہ صرف کھائی جاتی تھی بلکہ جوتیوں میں بھی بٹتی تھی۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ اس زمانے میں دلی کے گلی کوچوں کے باہر سرِ شام گداگر ہاتھوں میں سلیم شاہی جوتیاں لیے کھڑے رہتے تھے اور آوازیں لگاتے تھے دال بٹوالو، جوتیوں میں دال بٹوالو۔ آج کل سلیم شاہی جوتے کون پہنتا ہے، اس لیے دال چپلوں میں بٹتی ہے اور بڑی مشکل سے ملتی ہے۔

دال بگھارنے کا فن بھی اصلی گھی کے ساتھ عنقا ہو گیا۔ اپنے بچپن کا زمانہ یاد کیجیے۔ جب اصلی دال پر کڑکڑاتے ہوئے اصلی گھی میں لہسن یا پیاز کا بگھار دیا جاتا تھا۔ جس کی خوشبو اپنے محلہ سوئی والان سے ہمسائے کے والان تک پھیل جاتی تھی۔ شاید کچھ اور مصالحے بھی پڑتے ہوں گے کیوں کہ بزرگوں سے سنا ہے کہ واجد علی شاہ کے زمانے میں شرفو نام کا ایک باورچی شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ باورچی تھا۔ پوچھا گیا، کیا پکاتے ہو۔ بولا ''صرف دال پکاتا ہوں اور ایک کٹوری دال کے لیے ایک سو اشرفی لیتا ہوں''۔

واجد علی شاہ بولے ''میاں دال آخر تو دال ہی ہے، ایک کٹوری دال کے ایک سو اشرفی کیا معنی؟''

عرض کیا۔ ''جہاں پناہ۔ دالیں تو سب ہی ایک سی ہوتی ہیں۔ کیا مونگ، کیا مسور، اصلی چیز تو بگھار ہے۔ اس کے ایک سو اشرفی لیتا ہوں''۔ شرفو کو نزائیل پر رکھ لیا گیا۔ رات کو جب بارہ دری میں دسترخوان بچھا تو شاہ کے لیے ایک کٹوری دال بھی موجود تھی۔ واجد علی شاہ نے دال چکھی۔ فرمایا ''مزے میں خوب ہے لذیذ اور عمدہ ہے۔ مگر اس ایک کٹوری دال کے لیے ایک سو اشرفی؟ کچھ سمجھ میں آیا''۔

شاہ نے دال کے دو تین لقمے چکھ کر کٹوری الگ رکھ دی۔ شرفو نے آہستہ سے وہ کٹوری شاہی دسترخوان سے کھسکا لی اور اسے بارہ دری کے قریب ایک روش کے کنارے انار کے ایک سوکھے پیڑ پر ڈال کر چلا گیا۔

صبح جب واجد علی شاہ چمن کی سیر کو نکلے تو دیکھا کہ روش کے کنارے سے انار کا سوکھا ہوا پیڑ ہرا ہو چکا ہے۔ فوراً شرفو کو طلب کیا مگر شرفو رات ہی سے غائب ہو چکا تھا۔ پھر کبھی نہیں نظر آیا۔

اللہ اللہ ایک وہ دال پکانے والے باورچی تھے اور ایک ہمارے دوست خواجہ احمد عباس ہیں کہ ادیب، فلم ساز اور صحافی کے علاوہ باورچی ہونے کا بھی دم بھرتے ہیں اور ایسی عمدہ دال پکاتے ہیں کہ ہرے بھرے پیڑ پر ڈال دو پانچ منٹ میں سوکھ کر ٹھنٹھ ہو جائے گا۔

دال کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ حیدرآبادی دال: کہ مزے میں ترش بلکہ طنز آمیز معلوم ہوتی ہے۔ مخصوص بگھار اور اعلیٰ قسم کے چاول کے ساتھ کھائیے طبیعت مفرح ہو جاتی ہے اور جی بے اختیار کسی کی ٹانگ گھسیٹنے کو چاہنے لگتا ہے۔ حیدرآباد میں مزاح نگاروں کی کثرت کی وجہ یہی کھٹی دال ہے۔ میں خود جب اپنے ذہن میں مزاح کی کمی محسوس کرتا ہوں فوراً چند دن کے لیے حیدرآباد کا رخ کرتا ہوں۔ البتہ حیدرآبادی مزاح نگاروں کے لیے سال میں حیدرآباد کے چار چکر لگانا ضروری ہیں۔ ورنہ بور ہو کر یوسف ناظم صاحب کی طرح سنجیدہ شاعری پر اتر آتے ہیں۔

یوپی کی دال: بالعموم ارہر کی ہوتی ہے۔ اور اگر ارہر کی نہ ملے تو جو دوسری دال ملے گی وہ بھی ارہر ہی کی ہوگی۔ ارہر کے کھیت کو یوپی کے کلچر میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو سیب کے پیڑ کو کشمیر میں یا ناریل کے پیڑ کو کیرالا میں۔ ارہر کی دال میں ایک ہلکی سی بساندھ ہوتی ہے اور کہیں پر ایک ہلکی سی تلخی بھی، مجھے ارہر کی دال بالکل پسند نہیں مگر راہی معصوم رضا کو بہت پسند ہے۔ آپ انہیں دعوت پر بلانے کے لیے مرغ و ماہی کا ذکر کریں، کباب اور قورمے کا لالچ دیں، انکار کر دیں گے۔ ہاں ارہر کی دال کا ذکر کیجیے تو آپ کی دعوت میں بلا تکلف بلکہ بن بلائے بھی چلے آئیں گے۔ کچھ دوستوں کے خیال میں میرے اور راہی کے درمیان بنائے نزاع اردو ہندی کا جھگڑا ہے۔ جی نہیں، صرف ارہر کی دال!

ارہر کی دال میں اور کوئی خوبی ہو نہ ہو یہ خوبی تو ضرور ہے کہ اسے کھاتے ہی گونگے سے گونگا آدمی بھی بے تکان بولنے لگتا ہے اور مطالب اور معانی سے بے نیاز بولتا ہی چلا جاتا ہے۔ پورے یوپی میں یہی دال کھائی جاتی ہے۔

سانبھر کی دال: جو لوگ سانبھر کا شکار کر چکے ہیں کہیں مغالطے میں نہ رہیں۔ اس میں گوشت بالکل نہیں پڑتا۔ یہ جنوبی ہند کی مرغوب ترین دال ہے۔ معلوم نہیں کس دال سے پکاتے ہیں۔ کیونکہ اس میں دال نام کی کوئی شے نہیں ہوتی۔ البتہ لوکی، بینگن، پیاز اور کدو کے ٹکڑے ضرور ہوتے ہیں۔ اسے بالعموم ڈلی کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ اسے کھاتے ہی ذہن ''کلرکی'' کی طرف مائل ہوتا ہے، زیادہ کھاؤ تو بھارت ناٹیم کی طرح تھرکنے لگتا ہے۔

گجراتی دال: کچھ دالیں کھانے کے لیے ہوتی ہیں۔ گجراتی دال پینے کے لیے ہوتی ہے۔ اس میں گڑ بھی ڈالتے ہیں اور نمک بھی اور دودھ بھی اوپر سے غالباً ارنڈی کے تیل کا بگھار دیتے ہیں اور پیاز اور لہسن سے دور رکھتے ہیں۔ پہلی بار جب اس دال کی کٹوری میرے سامنے آئی تو میں نے آہستہ سے چمچہ چلا کر ٹٹولا کچھ پتہ نہ چلا کہ کون سی دال ہے۔ پھر انگلی پھیر کر معلوم کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ناچار نیکر پہن کر کٹوری میں اتر گیا۔ گھنٹہ بھر کی شناوری کے بعد پیندے میں دال کا ایک دانہ مل گیا۔ معلوم ہوا اس دال میں دانہ کم ہوتا ہے پانی زیادہ۔ آب و دانہ کی ترکیب غالباً اسی گجراتی دال نے سلجھائی ہے۔ پھر وہ جملہ بھی یاد آیا ''دانے دانے پر لکھا ہے کھانے والے کا نام''۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ گجراتی دال کی ہر کٹوری میں پتلے شوربے کے ساتھ

دال کا ایک دانہ ڈال دیا جاتا ہے اور دانے سے پہلے اس پر مہمان کا نام بھی چھاپ دیا جاتا ہے یا چپکا دیا ہے۔ تس پر میں نے صبر کیا اور کٹوری اٹھا کر دال کا سارا پانی پی لیا اور یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ اپنے حصے میں یہی دانہ پانی مقسوم تھا۔

کسی نہ کسی شکل میں یہی دال گجرات کے علاوہ مہاراشٹر، راجستھان، یوپی، بہار، اڑیسہ اور کرناٹک میں بھی رائج ہے۔ ہم ہندوستانی نہ صرف یہ کہ خود ہی دال کھاتے ہیں بلکہ اپنے کھلاڑیوں کو بھی یہی دال کھلاتے ہیں۔ اور اس کے بعد متعجب ہوتے ہیں کہ ہمارے کھلاڑی اولمپک گولڈ میڈل کیوں نہیں حاصل کرتے؟ کرکٹ کے ٹسٹ میچ کیوں نہیں جیت سکتے ہاکی کے میدان سے فتح کے جھنڈے لہراتے ہوئے کیوں نہیں آتے؟ کچھ لوگ یہ بھی سوچنے لگے ہیں کہ اگر ہم ان کھلاڑیوں کی جگہ اپنے مویشی کھیل کے میدان میں بھیجیں تو زیادہ تنومندی کا مظاہرہ کر سکیں گے، راوی اپنی رائے محفوظ رکھتا ہے۔

پنجابی دال: جیسا میں نے کہا ہے کچھ دالیں کھانے کے لیے ہوتے ہیں، کچھ پینے کے لیے، پنجابی دال کو چبانا پڑتا ہے۔ اس قدر گاڑھی ہوتی ہے کہ آپ چاہیں تو اسے چھری سے کاٹ سکتے ہیں۔ گاڑھی ہونے کے ساتھ ساتھ یہ کالی بھی ہوتی ہے۔ چاہے ثابت ماش کی دال ہو یا چھولے کی دال، اگر آپ کو کبھی امرتسر سے کلکتے تک گرانڈ ٹرنک روڈ سے سفر کرنے کا موقع ملے تو راستے میں آپ کو جگہ جگہ پنجابی ڈھابے ملیں گے جہاں یہ کالی دال بکثرت ملتی ہے اور اس قدر لذیذ ہوتی ہے کہ پیش تر اس کے کہ آپ اپنا ہاتھ روکیں آپ دو روٹی تنور کے ساتھ چار کٹوری دال کھا چکے ہوتے ہیں۔ گو اس عمل کے دو گھنٹے بعد معدے کی وہ حالت ہوتی ہے کہ جی چاہے تو گوبر گیس پلانٹ لگا لیجیے، ہفتوں کام دے گا۔

انسان کی طرح دال کے بھی مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ مونگ اور چنے کے بونٹ کی دالیں ہرے رنگ کی ہوتی ہیں۔ ارہر کی دال پیلے رنگ کی ہوتی ہے۔ بوبے کی دال لال رنگ کی ہوتی ہے۔ دونوں کو ملا کر کھلایئے تو آدمی غصے سے لال پیلا ہونے لگتا ہے۔

میں نے کچھ بنیوں کے ہاں بے حد سرخ رنگ کی دال بھی دیکھی ہے جسے ہمارے دوست اور اشتراکی شاعر نیاز حیدر بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔ سنا ہے اس دال کے کھاتے ہی اشتراکیت کے سارے رموز و اسرار چشم زدن میں آشکار ہو جاتے ہیں۔ ان دالوں کے رنگ میں ایک خاص وصف یہ ہے کہ اگر ان میں کچھ کالا کالا پڑ جائے تو فوراً دکھائی دینے لگتا ہے۔ جرأت کا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے:

منہ پر بکھرے بال ہیں سب اور ٹوٹا کان کا بالا ہے
ہم نے تو معلوم کیا کچھ دال میں کالا کالا ہے

یہ دال میں کالا کالا کی ترکیب کسی غیر پنجابی لغت دان کی ایجاد ہے ورنہ پنجابی دال میں تو سب کچھ کالا کالا ہوتا ہے۔

ہمارے زمانے میں اردو کی پہلی کتاب میں پنڈت جی کی بھلی ہوتی تھی اور مولوی صاحب کا گھوڑا ہوتا تھا۔ جب عمر میں ذرا آگے بڑھے تو شر پسندوں نے اس شر کو بڑھاوا دیا اب ہندو کی للیا تھی مسلمانوں کا لوٹا۔ ہندو کی دھوتی تھی، مسلمانوں کا تہمد۔ ہندو کی رسوئی تھی، مسلمانوں کا باورچی خانہ۔ ہندو کی دال تھی، مسلمانوں کا گوشت۔ اسی ''کی، کا'' کی جنسی انانیت اور فرقے

واریت نے ملک کا بٹوارہ کر دیا۔ اس وقت کسی نے نہ سوچا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب اس برصغیر میں کتے کا گوشت تیرہ روپے کلو بکنے لگے گا۔ اب کیا ہندو کیا مسلمان سب ہی دال کھاتے ہیں اور ''کی، کا'' کی بحث سے کتراتے ہیں۔

اسی کی، کا، کی بحث میں ان دنوں اردو ہندی کا جھگڑا بھی زور پکڑ گیا تھا۔ کچھ لوگ کہتے سنے گئے کہ ہندی صرف ہندوؤں کی زبان ہے اور اردو پر صرف مسلمانوں کا تصرف جائز ہے۔ آج کل بھی ایسے سر پھروں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔

دراصل کسی زبان کی ماہیت، ماخذ اور مزاج کو سمجھنے کے لیے اس کے محاوروں کے چلن کو بھی سمجھنا پڑتا ہے اور اس امر سے تو ہر کوئی واقف ہے کہ جو شے زیادہ سے زیادہ استعمال میں آتی ہے وہی محاوروں اور اس زبان کی تراکیب میں شامل ہوتی ہے۔

اب آپ اردو کی کوئی سی لغت اٹھا کر دیکھیے۔ آپ کو دال روٹی کا محاورہ ملے گا۔ دال گوشت کا نہیں۔ دال دلیہ کا ذکر ملے گا، دال قورمے کا نہیں۔ لوگ دال فے عین بولتے ہیں۔ گوشت فے عین کوئی نہیں بولتا۔ بس اس امر کا بدیہی ثبوت ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے بلکہ سارے ملک کی زبان ہے۔

قاعدے سے پہلے مجھے دال بگھارنے سے دال گلنے کا ذکر کرنا چاہیے تھا اور یہ کوئی آج کی بات نہیں شروع ہی سے سنتے آئے ہیں کہ دال نہیں گلتی۔ غریب کی امیر کے سامنے نہیں گلتی، امیر کی حاکم کے سامنے نہیں گلتی۔ مگر میرا تجربہ کہتا ہے کہ دال بہ آسانی گل سکتی ہے بہ شرطے کہ آپ اپنی دال کو خوشامد کی دھیمی دھیمی آنچ پر پکائیں اور کسی چمچے کی مدد سے بار بار ہلاتے جائیں۔ بلکہ اگر ہو سکے تو خود ہی چمچہ بن جائیں۔ اس کے بعد بھی اگر دال نہ گلے تو اپنی دیگچی کے گرد کسی صاحب ثروت کا تعویز باندھیں۔ اس پر بھی دال نہ گلے تو کسی معروف دال گلیے سے رجوع کریں۔ آج کل ہر چھوٹے بڑے شہر میں آپ کو ایسے دال گلیے مل جائیں گے جو سکہ رائج الوقت مناسب تعداد میں لے کر ہر قسم کی دال گلا سکتے ہیں، آزمودہ ہے۔

سنتے ہیں کہ تغلق کے زمانے میں جب ایک افغان سردار بہ سلسلۂ ملازمت براستہ خیبر ہندوستان وارد ہوتا اور جب یہاں اس نے ہر کس و ناکس کو دال سے روٹی کھاتے دیکھا تو حیرت میں رہ گیا بولا ''خو، تم کیسا جنگلی لوگ ہے؟ اناج کو اناج سے کھاتا ہے''۔ اس پر کسی نے اسے جواب دیا ''تم اناج کا ذکر کرتے ہو یہاں آدمی کو آدمی کھا جاتا ہے اور کسی کو حیرت نہیں ہوتی''۔

اس پر وہ افغان سردار مایوس ہو کر اپنے وطن لوٹ گیا۔ تقریباً اسی زمانے میں سنا ہے مولانا حافظ رحمت علیہ بھی تشریف لائے تھے اور کسی سرائے میں ٹھہرے۔ سرائے کی شوخ چشم بھٹیارن نے انہیں ایسی عمدہ دال پکا کے کھلائی کہ اش اش کر اٹھے اور جاتے جاتے سمرقند و بخارا کی دونوں ولایتیں اسے بخش گئے۔

حافظ کا وہ مصرعہ تو آپ نے سنا ہوگا:

یہ دال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

کچھ تنگ نظر لوگ یاں ''دال'' کی بجائے ''خال'' کا ذکر کرتے ہیں، یعنی یہ دال ہندوش بخشم کی جگہ بخال ہندوش بخشم پڑھتے ہیں۔ مگر یہ حافظ کے ساتھ سراسر بے انصافی ہے کیا حافظ نے ایرانی گلعذاروں کے خال نہیں دیکھے تھے جو یہاں کے خال پر حال میں آ جاتے۔ یقیناً یہاں دال ہی کا ذکر ہے۔

مگر یہ وہ زمانہ تھا جب ادھر کے لوگ ادھر نہیں جا سکتے تھے۔ اب صورت حال بدل چکی ہے۔ چنانچہ جب میں ہیڈ کلرکی کے عہدے سے ریٹائر ہوا تو سوچا اس گم نامی کی زندگی میں پڑے رہنے سے کیوں نہ سمرقند اور بخارا جایا جائے جو مولانا حافظ ہمیں بخش گئے ہیں۔

خیر کسی نہ کسی طرح سمرقند پہنچے مگر کسی نے نوٹس ہی نہ لیا۔ بخارا گئے وہاں بھی یہی حال ہوا۔ ہم نے حافظ کے شعر کا حوالہ دیا تو بولے۔ آج کل سمرقند اور بخارا دونوں سوویت روس کی تحویل میں ہیں۔ میں نے کہا "مگر مولانا حافظ تو ہمیں بخش گئے ہیں۔ یقین نہ آئے تو ویسی ہی دال پکا کر دکھائیں"۔ وہ بولے "میاں دال کوئی کھاتا ہی نہیں"۔ اس پر ہم کچھ چراغ پا ہوئے وہ لوگ سیخ پا ہوئے۔ آخر ہم گردن جھکا کر خاک پا ہوئے۔

سوچ لیا آئندہ کسی شاعر کا اعتبار نہیں کریں گے، اگر وہ سمرقند کے بجائے شکر قند اور بخارا کی جگہ آلو بخارا ہی ہمیں بخش دے ہم کبھی اعتبار نہ کریں گے۔

سوال و جواب

۱۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ کو دوسروں کی دال میں کالا کالا نظر آتا ہے؟
جواب کے لیے بغلیں جھانکیے۔

۲۔ دال دیکھ، دال کی دھار دیکھ۔ کس قسم کی دال کے لیے استعمال ہوتا ہے اور کیوں؟
جن طالب علموں کے پاس تیرنے کی سند موجود نہ ہو جواب دینے کی کوشش نہ کریں۔

۳۔ دال گلنے کے طریقے بتائیے۔ اگر ان طریقوں کے استعمال سے آپ کے ساتھ آپ کا ضمیر بھی گل جائے تو آپ کیا کریں گے؟
ویسے اس سوال کا صحیح حل میرے پاس بھی موجود نہیں ہے۔

توضیح کتابیات قائداعظم لائبریری

۱۔ توضیحی کتابیات اصول فقہ	سید عبدالرحمٰن بخاری
۲۔ علوم حدیث	حافظ خبیب احمد
۳۔ گوہر نایاب	غلام احمد چوہدری
۴۔ توضیحی کتابیات حدیث	حافظ خبیب احمد

اردو کی آخری کتاب

پطرس بخاری

ماں کی مصیبت

ماں بچے کو لیے بیٹھی ہے، باپ انگوٹھا چوس رہا ہے اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے، بچہ حسب معمول آنکھیں کھولے پڑا ہے، ماں محبت بھری نگاہوں سے اس کو تک رہی ہے اور پیار سے حسب ذیل باتیں پوچھتی ہے۔

(۱) وہ دن کب آئے گا جب تو میٹھی میٹھی باتیں کرے گا؟

(۲) بڑا کب ہوگا؟ مفصل لکھو

(۳) دولہا کب بنے گا اور دلہن کب بیاہ کر لائے گا؟ اس میں شرمانے کی ضرورت نہیں۔

(۴) ہم بڈھے کب ہوں گے؟

(۵) تو کب کمائے گا؟

(۶) آپ کب کھائے گا اور ہمیں کب کھلائے گا، باقاعدہ ٹائم ٹیبل بنا کر واضح کرو۔

بچہ مسکراتا ہے اور کیلنڈر کی مختلف تاریخوں کی طرف اشارہ کرتا ہے تو ماں کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ جب ننھا ہونٹ نکال کر رونی صورت بناتا ہے تو بے چین ہو جاتی ہے۔ سامنے پنگوڑا لٹک رہا ہے، سلانا ہو تو افیون کھلا کر اس میں لٹا دیتی ہے۔ رات کو اپنے ساتھ سلاتی ہے، باپ کے ساتھ دوسرا بچہ سوتا ہے۔ جاگ اٹھتا ہے تو جھٹ چونک پڑتی ہے اور محلے والوں سے معافی مانگتی ہے، کچی نیند میں رونے لگتا ہے تو بیچاری ممتا کی ماری آگ جلا کر دودھ کو ابال دیتی ہے۔ صبح جب بچے کی آنکھ کھلتی ہے تو آپ بھی اٹھ بیٹھتی ہے، اس وقت تین بجے کا عمل ہوتا ہے۔ دن چڑھے منہ دھلاتی ہے، آنکھوں میں کاجل لگاتی ہے اور جی کڑا کر کے کہتی ہے "کیا چاند سا مکھڑا نکل آیا۔ واہ واہ"۔

کھانا خود پک رہا ہے

دیکھنا بیوی آپ بیٹھی کھانا پکا رہی ہے، ورنہ دراصل یہ کام میاں کا ہے۔ ہر چیز قرینے سے رکھی ہے۔ دھوئے دھائے برتن دھرے ہیں، کسی میں دال ہے، کسی میں آٹا۔ چٹکنی اور پانی کا لوٹا چولہے کے پاس ہے تاکہ جب تک چاہے آگ جلائے اور جب چاہے پانی ڈال کر بجھا دے۔ آٹا گندھ رہا ہے، چاول پک چکے ہیں نیچے اتار کر رکھے ہیں، دال چولہے پر چڑھی ہے، غرض یہ کہ ہر کام ہو چکا ہے، لیکن یہ پھر بھی پاس بیٹھی ہے۔ میاں جب کہتا ہے کھانا لا کر سامنے رکھتی ہے، پیچھے کبھی نہیں رکھتی۔ کھانا کھا لیتا

ہے تو کھانا اٹھائی ہے۔ ہر روز یوں نہ کرے میاں کے سامنے ہزاروں برتنوں کا ڈھیر لگ جائے۔ کھانا پکانے سے فارغ ہوتی ہے تو کبھی سینا لے بیٹھتی ہے کبھی چرخہ کاتنے لگتی ہے۔ کیوں نہ ہو مہاتما گاندھی کی بدولت یہ ساری باتیں سیکھی ہیں، آپ ہاتھ پاؤں نہ ہلائے تو ڈاکٹر سے علاج کروانا پڑتا ہے۔

دھوبی آج کپڑے دھو رہا ہے

بڑی محنت کرتا ہے، شام کو بھٹی چڑھاتا ہے، دن بھر بیکار بیٹھا رہتا ہے، کبھی بیل پر لادی لادتا ہے اور گھاٹ کا رستہ لیتا ہے۔ کبھی نالے پر دھوتا ہے، کبھی دریا پر، تاکہ کپڑوں والے نہ پکڑ سکیں۔ جاڑا ہو تو سردی ستاتی ہے، گرمی ہو تو دھوپ جلاتی ہے، صرف بہار کے موسم میں کام کرتا ہے۔ دوپہر ہونے کو آئی، اب تک پانی میں کھڑا ہے اسے ضرور سرسام ہو جائے گا، درخت کے نیچے بیل بندھا ہے، جھاڑی کے پاس کتا بیٹھا ہے۔ دریا کے اس پار گلہری دوڑ رہی ہے، دھوبی اسی سے جی بہلاتا ہے۔

دیکھنا دھوبن روٹی لائی ہے، دھوبی کو بہانا ہاتھ آیا ہے، کتے نے بھی کان کھڑے کر دیے، اب دھوبن گانا گائے گی، دھوبی دریا سے نکلے گا، دریا کا پانی پھر نیچا ہو جائے گا۔

میاں دھوبی! یہ کتا کیوں پال رکھا ہے؟ صاحب کی کہاوت کی وجہ سے، اور پھر یہ تمہارا چوکیدار ہے، دیکھیے امیروں کے کپڑے میدان میں پھیلے پڑے ہیں کیا مجال کوئی پاس آ جائے، جو ایک دفعہ کپڑے دے جائیں پھر واپس نہیں لے سکتے۔ میاں دھوبی تمہارا کام بہت اچھا ہے۔ میل کچیل سے پاک وصاف کرتے ہو، ننگا پھراتے ہو۔

لوگ ناؤ میں بیٹھ کر دریا سے پار اتر رہے ہیں

حاجی لق لق

آج دریائے اسمبلی چڑھاؤ پر ہے۔ کہیں زور کا منہ برسا ہے۔ کتنا بڑا پاٹ ہو گیا ہے۔ اب لوگ ناؤ کے بغیر نہ ادھر آ سکتے ہیں، نہ ادھر جا سکتے ہیں۔ دیکھو اتحاد پارٹی کی ناؤ ادھر کے کنارے سے چلی۔ خضر، چھوٹو اور بلدیو ملاح چپوؤں سے کھیلتے جا رہے ہیں۔ کیسی کھچا کھچ بھری ہوئی ہے۔ مرد ہیں، مرد نما عورتیں ہیں، بچے ہیں اور ہریانے کے بیل بھی ہیں، جو مونچھوں سے سینگوں کا کام لیتے ہیں۔ چھوٹو ملک کے پیچھے ایک لوٹا بھی رکھا ہے۔ اب دریا کے بیچ ناؤ آ گئی۔ ایلو! ایکا ایکی ناؤ والے چیخنے لگے۔ کیا ہوا؟ کہیں ناؤ ڈوبتی تو نہیں؟ کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ ملاح خوب زور لگاتے ہیں۔ غل مچاتے ہیں اور لوگ بھی ان کے ساتھ چلاتے ہیں۔ کوئی اللہ کا نام پکارتا ہے، کوئی رام کا اور گورو کا۔ ایک ہنری کریک کا نام پکار رہا ہے۔ ایک یا ایمرسن یا ایمرسن چلا رہا ہے۔ ایک گلیسی کی دہائی دے رہا ہے۔ لیکن یہ ناؤ پتی نظر نہیں آتی۔ جو آدمی تیراک تھے وہ ناؤ کے آثار دیکھتے ہیں پانی میں کود پڑے اور تیر کر نکل آئے۔ ان میں تین نوجوان تھے۔ وہ کئی ایک ایسے آدمیوں کو بھی بچا کے لے آئے جن کو تیرنا نہیں آتا تھا۔

اونٹ لدر ہا ہے!

یہ لدو اونٹ ہیں۔ غداری کی بوریاں اوپر لدی ہیں۔ جب لادتے ہیں تو بے چارے منہ پھاڑ پھاڑ کر چلاتے ہیں۔ کبھی گردن اٹھاتے ہیں، کبھی جھکاتے ہیں، فریاد کرتے ہیں کہ ظالم ساربان ہمیں ستاتا ہے۔ یہ بھاگ کیوں نہیں جاتے؟ بھاگیں کیوں کر؟ سونے کی زنجیروں سے گھٹنے بندھے ہیں۔ بعض اونٹوں پر اسباب نہیں لادتے، کجاوے باندھتے ہیں۔ یہ ملتان کے اونٹ ہوتے ہیں۔ ان پر آدمی چڑھتے ہیں۔ بڑا آرام پاتے ہیں۔ چاہیں لیٹیں، چاہیں سوئیں۔ اونٹ گردن ہلاتا سیدھا چلا جاتا ہے۔ قطار میں اونٹنیاں بھی ہوتی ہیں اور ان کے بچے بھی۔ بھروال کا ایک بچہ ماں کے پیچھے پیچھے چلا جاتا ہے۔ وہ بھی مڑ مڑ کر محبت بھری نگاہوں سے دیکھتی جاتی ہے۔ کیا کرے؟ بے بس ہے۔ ٹھہر نہیں سکتی۔ قطار میں نکیل بندھی ہے۔ ڈیرہ غازی خان میں اونٹ بڑا کام دیتا ہے۔ ایک تو ریت میں خوب چلتا ہے۔ دوسرے پانی بہت کم مانگتا ہے۔ مشکل سے سات بالٹیاں دستیاب ہوتی ہیں۔ یہی بے چارہ ہے کہ بن پانی ڈیرہ غازی خان سے چل کر لاہور کے اسمبلی چیمبر تک پہنچ جاتا ہے۔ ذرا تصویر تو دیکھو! یہ اونٹ کے پیچھے کون ہے؟ کوئی لونا تو نہیں؟

استاد بوٹے خاں گلزار کا حال

خضر تمیمی

آل انڈیا ریڈیو نے کچھ عرصے سے اردو ادب کی مستند کتابوں پر پیروڈی کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ خضر تمیمی نے آبِ حیات کی پیروڈی لکھی جو ڈائریکٹر آل انڈیا ریڈیو کی اجازت سے شائع کی جاتی ہے۔

جس وقت وہ صاحب کمال ادب کی گاڑی میں ایجاد کے گھوڑے کو جوت کر عالمِ ارواح سے کشورِ اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے سخن کے ہر موڑ سے ''بچ جاؤ''، ''بچ جاؤ'' کی آوازیں بلند کیں۔ عقدِ ثریا اس کے گھوڑے کا دانہ بنا جسے آبِ حیات میں بھگویا گیا۔ اب ایک ایسے استاد کا ذکر پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں جس پر نظم اردو کا خاتمہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو۔ جی یہی چاہتا ہے کہ کوئی حرف اس گراں بہا داستان کا نہ چھوڑوں، کیونکہ اس شعر کے پتلے کے گھوڑے کا بھی رونگٹا رونگٹا بیکار نہ تھا۔ اس واسطے میں لکھوں گا اور سب کچھ لکھوں گا، ایک حرف نہ چھوڑوں گا۔

یہ جھنڈے خاں پرچم کے بیٹے تھے جنہوں نے تیس سال تک سنٹرل ماڈل سکول کی ڈرل ماسٹری کے اکھاڑے کو اپنی جسمانی ورزشوں کے علاوہ دماغی کاہشوں سے بھی اندر کا اکھاڑا بنائے رکھا۔ ان دنوں ملحقہ ٹریننگ کالج میں نارمل اور ایس وی کی جماعتیں بھی ہوتی تھیں، جن کے طلبہ کو استاد پرچم مرحوم اصلاح بھی دیا کرتے تھے۔ ابتدا میں ان کی تنخواہ بہت کم تھی۔ اس لیے زبان کی آبیاری کے لیے وہ اپنے اشعار کو کہ فرزندان معنوی شاعر کے ہوتے ہیں، مشتاقان سخن میں اس طرح سے تقسیم فرماتے تھے کہ بیس تیس پرچے اپنی نیکر کی دونوں جیبوں میں بھر کر ہر شام سنٹرل ٹریننگ کالج کے گراؤنڈ میں کھڑے ہو جاتے۔ جو ہر سخن کے پرکھنے والے جوق در جوق آتے اور خاطر خواہ انعام دے کر مختلف پرچے لے جاتے تھے۔ لطف یہ تھا کہ دو ماہ کے بعد پرچے دینے کی بجائے آپ شاگردوں سے خود شعر کہلواتے اور انہیں سن سن کر خوش ہوتے۔

لطیفہ: پرچم مرحوم سے جب اس کا سبب پوچھا گیا تو فرمانے لگے کہ یہ زبان کی ترویج کا جبری طریقہ ہے کیونکہ اول اول خریدارِ سخن جب ان شاہ پاروں کو مشاعرے میں پڑھتا ہے تو وہ محسوس نہیں کرتا کہ اسے قدردانوں کے حلقے میں ایک نغز گو شاعر کی حیثیت دی جا رہی ہے۔ ایک شاعر کی ہستی مسلم ہو چکنے کے بعد اس کی امداد سے ہاتھ کھینچ لینا چاہیے۔ وہ بڈھا استادِ سخن اس بات کو خوب جانتا تھا کہ اپنی شہرت کو برقرار رکھنے کے لیے مبتدی جبری شعر گوئی شروع کر دے گا۔ اس میں نکتہ یہ تھا کہ جن لوگوں کو شاعر نہ ہونا ہوتا تھا وہ بھی طوعاً کرہاً اس فن شریف کو ''جزویست از پیغمبری'' اختیار کر لیتے تھے۔ اللہ اللہ کیا لوگ تھے اور کیا زمانہ تھا یہ سب انہی باکمالوں کا صدقہ ہے کہ گاؤں کے سو مدرسوں میں نوے مدرس شاعر ہیں اور باقی دس بھی تخلص کے سوا نہیں

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں — اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

استاد بوٹے خاں گلزار کی والدہ کے جیتے جی ان کے والد نے نکاح کر لیا تھا۔ چنانچہ وہ اس واقعے سے دو ماہ بعد پیدا ہوئے تھے۔ پرچم مرحوم کو نئی دلہن سے زیادہ محبت تھی، اس لیے ان کی تعلیم و تربیت میں بہت غفلت برتی گئی۔ ان کی والدہ نے چنگڑ محلہ میں ایک مکان لے رکھا تھا۔ وہ عفیفہ وہیں قناعت کی چادر اوڑھے گزران کر رہی تھی اور بوٹے خاں بھی کبھی ٹریننگ کالج کی سڑک والی دیوار پر بیٹھ کر اپنے والد بزرگوار کے احکام اور ان کی فوری تعمیل کے منظر دور ہی سے دیکھ لیا کرتے تھے۔ ان کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ بچپن میں ان کی والدہ کہیں چکی پیسنے گئی تھی۔ یہ جھولے میں پڑے رو رہے تھے کہ اتنے میں ایک کتا آیا اور ان کے ہاں سے ایک روٹی لے کر چلتا بنا۔ انہوں نے اپنی توتلی زبان میں کتے کی آمد اور روٹی کی گمشدگی کی داستان کو ایسے دلآویز طریقے سے ادا کیا کہ ماں کو روٹی کھونے کا غم جاتا رہا اور انہوں نے بچے کو گود میں اٹھا کر پیار کیا اور اپنے خاوند کے خلاف دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے پیش گوئی کی کہ اس موئے سے یہ بچہ ہزار درجے اچھا شاعر ہوگا۔ استاد مرحوم فرماتے تھے کہ یہ سب کچھ ان کی والدہ کی دعا کا اثر تھا۔

وحیدی سلمہٗ (کہ مستند نشانی بزرگوں کی ہیں) فرماتے ہیں کہ میں نے خود بوٹے خان کی والدہ سے جب اس واقعہ کی صحت کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے یاد کر کے اس کی تصدیق کی اور کہا کہ فی الحقیقت اس وقت بوٹے خان کی عمر برس دن سے کچھ کم تھی۔ جھنڈے خان پرچم مرحوم اپنی ایک آواز کے ساتھ سینکڑوں گردنوں کا جھکنا دیکھنے کے عادی تھے۔ انہوں نے نکاح ثانی کر لیا۔ وحیدی صاحب لکھتے ہیں کہ نکاح ثانی سے تین ماہ پیشتر انہیں محکمہ تعلیم میں اگلا گریڈ بھی مل گیا تھا اس لیے آئندہ فراغت کے پیش نظر انہوں نے بیاہ کیا۔ اگرچہ باپ نے ان کی تعلیم و تربیت میں کوئی حصہ نہ لیا تھا لیکن ان کے شاگردانِ تعلیمی کہ اکثر ان میں سے شاگردانِ معنوی بھی تھے، پر شاباش ہے کہ ان میں سے بعض ننھے بوٹے خاں کو بزرگوں کی نشانی سمجھ کر گلے کا تعویذ بنائے پھرتے تھے اور جس سے جو کچھ بن پڑتا تھا اپنے استادزادے کی خدمت سے دریغ نہ کرتا تھا۔ ان شاگردوں میں فخر کا طرہ دستار منشی جیون بخش اجل مرحوم کو ملا۔ جنہوں نے ہمت کی کمر باندھ کر ایک جمعۃ الوداع کو شاہی مسجد لاہور میں چندہ کر کے بوٹے خاں کے لیے ایک گھوڑا اور تانگہ خریدا۔ جس سے یہ دونوں ماں بیٹا فراغت سے گزران کرنے لگے۔ اس وقت استاد مرحوم کی عمر انیس برس کی تھی۔ آپ نے چالیس سال کی عمر تک لاہور میں کوچوانی کی۔ وردی میں امتیاز اور بقائے دوام کا تمغہ لگایا اور نقارہ فخر کی اس آواز کو کوئی نہیں دبا سکتا کہ ایک مرتبہ بھی قانون شکنی کے سلسلے میں ان کا چالان نہیں ہوا۔

استاد کا معمول تھا کہ صبح چار بجے سے بارہ بجے تک اور پھر تین بجے شام سے رات کے ۹ بجے تک تانگہ چلاتے تھے اور باقی وقت مشق سخن کی نذر کرتے تھے۔ بارہ بجے سے تین بجے تک دوست احباب کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ شاگرد غزلیں اصلاح کو دیتے تھے نوکر انہیں ایک کھارو سے کر تھیلی میں بھر کر پہلو میں رکھ دیتے تھے۔ وہ بھی بناتے تھے اور ملاقاتیوں سے باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ ان کی محویت کا یہ عالم تھا کہ چنگڑ محلے والے مکان کی بیٹھک میں ایک نلکا لگا ہوا تھا۔ آپ کی عفیفہ ماں ہمیشہ کمیٹی کے نلکے سے پانی بھرتی رہی اور استاد کو معلوم بھی نہ ہوا کہ ان کے گھر میں گنگا موجود ہے۔ ایک دن جب اندھیرے میں کہ اس گھر میں بجز شاعری کے نور کے اور کچھ نہ تھا۔ اجل مرحوم کا پاؤں اس سے الجھا تو استاد نے کہا کہ ''کیا ہوا؟'' انہوں نے جواب دیا کہ کچھ یونہی نلکے سے پاؤں نے ٹکر لی ہے۔ یہ فرمانے لگے ''یہاں نلکا بھی ہے؟'' انہوں نے عرض کی ''حضرت اسی لیے تو آپ کو یہاں لائے ہیں کہ ہر وقت پانی ملتا رہے''۔ ان کے پاس چھپے پرانے مسودے غزلوں کے پڑے تھے۔ ان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ میں تو اس باغ کی آبیاری میں ایسا لگا ہوں کہ ان کے نلکے کی خبر ہی نہیں۔ یہ کہہ کر چپکے ہو رہے۔ کیا محویت ہے۔ کئی برس گزر جائیں، واٹر ٹیکس برابر ادا کرتے رہیں اور یہ پتہ نہ ہو کہ گھر میں نلکا موجود ہے۔ خیر ثمرہ اس کا یہ ہوا کہ انہوں نے دنیا کے نلکے کی

طرف نہ دیکھا اور خدا نے ان کے کلام میں وہ روانی دی کہ آج پانی بھی اس کے آگے پانی بھرتا ہے۔

ایک دفعہ لاہور میں موٹر بسیں رائج ہوئیں۔ اسٹیشن سے ہائی کورٹ تک چھ پیسے کرایہ تھا۔ راستے میں جو اترے اکنی دے۔ مشتاقان سخن نئی چیز پر ٹوٹ پڑے۔ حتیٰ کہ اکنی میں سالم ٹانگے کو کوئی نہ پوچھتا تھا۔ میرے دوستو! وہ زمانہ عجیب زمانہ تھا۔ صبح سویرے گھوڑے کا یہ خرچ کہ چھ پیسے کا گڑ، اڑھائی آنے کا آٹا اور تین آنے کا دانہ۔ دوسرے تیسرے دن مصالحہ۔ دوپہر کو ڈنر کے طور پر ہرا چارہ۔ شام کو پھر چھ آنے کا دانہ گویا ایک روپیہ یومیہ اکیلے گھوڑے کا خرچ اس پر خانگی اخراجات مستزاد۔ اس دوران میں ایک دفعہ استاد مرحوم پر دو وقت فاقے سے گزر گئے۔ نبض شناس ماں نے کہ بیٹے کی طبیعت سے پوری طرح واقف تھی، زبان طعن سے ان کی ہمت کے سمند کو تازیانہ دیا کہ "تجھے ٹانگہ چلانے کے سوا اور کچھ نہیں آتا"۔ یہ سن کر وہ خاموش سے ہو گئے۔ دوسرے دن ان کی والدہ کو اپنے میکے کالا شاہ کاکو جانا تھا۔ یہ راستہ اور بھیس بدل کر گاڑی کے اس ڈبے میں پہنچ گئے جس کے ایک گوشے میں اس کی ماں پڑی تھی۔ انہوں نے متانت کے ساتھ جیب سے ایک شیشی نکالی اور بلند آواز سے پکارے "صاحبان! ہمارے کارخانے کی دواؤں کی پہلی ہی خوراک اپنا اثر دکھاتی ہے"۔ اس کے بعد آپ نے خوب زور شور سے مقولے پڑھنے اور شعر رٹنے شروع کر دیے۔ پھر انہوں نے ایک پڑیا نکالی جس میں وہ ایک ایک سولف پر کھانڈ لپیٹی گئی تھی۔ اس کی دو دو گولیاں آپ نے گاڑی میں مفت بانٹنا شروع کیں۔ جو آتا الفریہ خواہ مخواہ مرد آدمی دیکھ کر ان کی بات کا یقین کر لیتا۔ یہ انہیں گولیاں چکھاتے تھے۔ پھر ان سے پیسے کماتے تھے۔ جن دوستوں سے راز کہہ رکھا تھا انہوں نے ان کی والدہ کو خبر کی۔ اس ممتا کی ماری نے آنکھ کھولی۔ دیکھا تو فی الحقیقت ادھنیوں، دھیلوں پیسوں اور کوڑیوں کے ڈھیر ان کی جیب میں کھنکھنا رہے ہیں۔ اس تفریح طبع یا لیاقت ہرفنی کے اظہار کے ساتھ نکتہ یہ تھا کہ ماں بیٹے کو محض وبال دوش نہ سمجھے اور نہ کو چوانی کا پابند جانے۔ جس کوچے میں جائے گا کچھ اچھا ہی لے نکلے گا۔

نازک مزاجی: نقل۔ ایک دن آپ نے کسی موچی سے اپنا بوٹ جو بزرگوں کی نشانی تھی کھٹوایا۔ اس نے معمول سے زیادہ موٹے دھاگے کے ساتھ سیا۔ اتفاق سے اس وقت ان کے پاس کوئی اور جوڑا نہ تھا۔ چنانچہ مجبوراً اسی کو پہننا پڑا۔ لیکن فوراً ہی پاؤں میں درد ہونے لگ گیا۔ فرماتے تھے کہ میں نے کبھی باقاعدہ طور پر تعلیم حاصل نہیں کی لیکن رینالڈ کے سارے ناول اور منظوم ہیر رانجھا کے قصے کی تمام جزئیات گویا ان کی زبان پر تھیں۔ مگر مجھے اس پر تعجب نہیں۔ ٹانگے چلاتے وقت گھوڑے پر فی البدیہہ منظوم غصہ اتارتے تھے تو مجھے حیرت نہیں۔ سواری کے ساتھ کرائے کا تصفیہ بھی نظم میں کرتے تھے، اس کا بھی خیال نہیں۔ کیونکہ جس فن کو وہ لیے بیٹھے تھے یہ سب اس کے لوازمات ہیں۔ ہاں تعجب یہ ہے کہ وہ نوشادر کا ایک استعمال بھی جانتے تھے جس سے بڑے بڑے قلعی گران کے مرید ہوتے تھے۔ دودھ دوہنے میں ایسی صفائی اور چستی برتتے تھے کہ اس پر تعجب کیا کرتے تھے۔ بعض جولاہوں کو ان کے فن میں قابلیت خداداد سے انہوں نے ایسی ایسی اصلاحیں دی ہیں جو آج تک دل پر نقش ہیں۔ تیل کی تجارت کے اسرار وہ جانتے تھے۔ حکمت کی گتھیاں وہ سلجھاتے تھے۔ خواب کی تعبیر میں انہیں خدا نے ایک ملکہ راسخہ دیا تھا۔ فرماتے تھے کہ انسان کو دنیا بھر کے علوم سے واقفیت رکھنی چاہیے۔ وہ اس دنیا کو ایک دلچسپ چیز سمجھتے تھے۔ خود فرماتے ہیں:

گلزار ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

آپ کی وضع داری کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ اوائل عمر میں گھوڑے اور ٹانگے کا شغل اختیار کیا تھا۔ پھر ہمیشہ اس مضمون کو اپنے اشعار میں باندھا کیے۔ ذرا دیکھنا کس قدر گرم مطلع ارشاد فرمایا ہے:

گھوڑے کو کداتا ہوا وہ شوخ گر آوے
اللہ کی قدرت کا تماشہ نظر آوے

استاد مرحوم کی عمر بتیس سال کی تھی، جب آپ نے اپنی مشہور آفاق کتاب "گھوڑے کے جنسی تعلقات" تصنیف فرمائی۔ آپ نے علم نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس میں گھوڑے کی دماغی، عقلی اور جسمانی حرکات پر ایک ایسا محاکمہ کیا ہے جس کا جواب نہیں۔ لطف یہ ہے کہ اس کے جس قدر خیالات بلند ہیں اتنے ہی زبان تعریف سے بالا ہے۔

لطیفہ: ایک دفعہ عجیب اتفاق ہوا۔ لاہور میں جوبلی کے جشن پر ایک مشاعرہ منعقد ہو رہا تھا جس میں یوپی تک کے قسمت آزما شریک ہو رہے تھے۔ استاد گلزار مرحوم نے بھی شاگردوں کے اصرار پر ایک غزل لکھی۔ مطلع تھا:

نہ سرکس کا نہ منڈی کا نہ یہ بازار کا گھوڑا
لڑے گا آج دو دو ٹکریں گلزار کا گھوڑا

جیون بخش اجل فرماتے تھے کہ اس کے بعد جب وہ اپنے ٹانگے پر سوار ہو کر مشاعرے کو چلے تو موچی دروازے کے قریب گھوڑا بدکا اور ان کے ٹانگے کی کہیں ٹکر ہو گئی۔ اجل مرحوم لکھتے ہیں کہ میں نے حیران ہو کر استاد سے پوچھا کہ حضرت کیا آپ کو پہلے ہی اس کا علم تھا؟ تو آہستہ سے فرمایا کہ بس بیٹھے بیٹھے کبھی کچھ ہو جاتا ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ ان میں کرامات تھیں یا وہ غیب دان تھے۔ ایک حسن اتفاق تھا جو لطف طبع کے لیے لکھ دیا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ایک دفعہ مشاعرے میں غزل ہوئی جس کا مطلع تھا:

اے گلزار اگرچہ ہم کو آپ سے کوئی بیر نہیں
لیکن کچھ آثار برے ہیں عشق میں اب کے خیر نہیں

گھر پہنچے تو ان کی عفیفہ بیوی اور ضعیفہ ماں دونوں برس پڑیں کہ ہم غریب آدمی ہیں دو ٹکے کی اوقات۔ موئے شاعروں کی طرح خاک پھانکنا کوئی تمہیں زیب دیتا ہے۔ اس پر بی اماں نے جھاڑو اور بیوی نے جوتوں سے اپنے حال میں مگن رہنے کی تاکید کی۔ اور وہ شرافت کا پتلا صبر و استقلال سے ان تمام مصائب کو جھیلتا رہا۔ اللہ اللہ کیا لوگ تھے اور کیا زمانہ تھا۔ اتفاق سے مرزا طل بوق شیرازی جو خود صاحب دیوان اور ان کے جلیل القدر شاگردوں میں سے تھے، مشاعرہ کے بعد پھر ان کے گھر پر موجود تھے۔ اس واقعہ کے فوراً بعد انہوں نے اس مطلع کو پڑھا اور پوچھا کہ حضور یہ کیا؟ جو کچھ زبان سے نکلتا ہے وہ بعد میں ہو جاتا ہے۔ اس پر آنکھیں بند کر کے فرمایا کہ بس ادھر ہی کا فیضان ہے۔

اخیر میں استاد نے تانگہ چلانا چھوڑ دیا تھا۔ ان کے گھر کے قریب ہی چند احباب رات کے پردے میں قمار بازی کے ذریعے قسمت آزمائی کیا کرتے تھے۔ یہ بھی انہیں کے پاس رہتے۔ کسی کے جیتنے پر قصیدہ اور ہارنے پر مرثیہ لکھتے۔ ان کا مقولہ تھا کہ مرد وہ ہے جسے معمولی ضروریات زندگی بھی میسر نہ ہوں اور وہ ان کے لیے تگ و دو میں مصروف رہے۔

ایک روز شاہ محمد غوث کے تکیہ کے باہر رات بسر کی۔ آپ ابھی سو ہی رہے تھے کہ الاؤ بجھ گیا اور صبح ہوتے ہوتے وہ استاد یگانہ، جس کے بعد اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا قادر الکلام ہندوستان میں پیدا ہو، نمونیہ کی وجہ سے پاس والے راکھ کے ڈھیر کی طرح خاک کا ڈھیر ہو گیا۔ افسوس اتنے شاگردوں کے ہوتے ہوئے کسی بے حیا کو اتنی توفیق نصیب نہیں ہوئی کہ اس کی تاریخ وفات ہی کہتا:

یوں مریں اہل کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

مخزن پر آپ کی آرا اور تبصرے

اردو تیرے گردوں کا دمکتا ہوا تارہ
پوشیدہ جو بادل میں تھا چمکا وہ دوبارہ
اللہ کرے پائے حیات ابدی اب
''مخزن'' کے نئے دور کا ہر ایک شمارہ

(پروفیسر جگن ناتھ آزاد، صدر انجمن ترقی اردو۔ نئی دہلی)

☆☆☆☆☆☆☆

اپنے علمی اور معیاری مضامین کی وجہ سے ادبی دنیا میں مخزن کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ خصوصاً آپ کی ادارت میں یہ رسالہ اپنے ہر شمارے میں نئے اور انفرادی موضوعات کی وجہ سے ہندوستان میں کافی مقبول ہے۔ اس دفعہ کے شمارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا مضمون ''دانشور ادیب کی ذمہ داریاں'' موجودہ دور کے بدلتے ہوئے حالات میں ادیبوں کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلا رہا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کا مضمون بھی حلقۂ ارباب ذوق کے حوالے سے خیال افروز ہے۔ غالبیات اور اقبالیات کے گوشے میں شامل مضامین بھی غالب فہمی میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ آپ کی ادارت میں نکلنے والا یہ رسالہ بین الاقوامی سطح پر ادب کے حوالے سے قارئین کو دعوت فکر دے گا۔

شاہد ماہلی
ڈائریکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی

☆☆☆☆☆☆

اردو ادب کی تاریخ کی تین حقیقتیں مماثلت کے اعتبار سے بڑی معنی خیز ہیں۔
اول: بیسویں صدی کا ادبی آغاز شیخ عبدالقادر کے ماہنامہ ''مخزن'' سے ہوا۔
دوم: تشکیل پاکستان کے بعد اردو ادب کو اولیں فروغ رسالہ ''مخزن'' نے دیا جس کی نشاۃ ثانیہ ادارہ ''نوائے وقت'' نے برپا کی اور مولانا حامد علی خان اس کے مدیر مقرر ہوئے۔

سوم: اکیسویں صدی کا آغاز بھی ''مخزن'' کے ایک نئے دور سے ہوا اور اس کا پہلا پرچہ قائداعظم لائبریری کے زیر اہتمام ڈاکٹر وحید قریشی کی ادارت میں ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا تھا۔

زیر نظر اس عہد ساز رسالے کا دوسرا شمارہ ہے جس میں ادب کے چند اہم موضوعات پر ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر معین الدین عقیل، ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، فتح محمد ملک، محمد ہارون عثمانی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر انور سدید اور امجد اسلام امجد نے لکھا ہے۔ صدر مجلس جناب عنایت اللہ ہیں۔

(''نوائے وقت'' ۱۷ اگست ۲۰۰۲ء)

☆☆☆☆☆☆☆

رسالہ ہر اعتبار سے نہایت اعلیٰ درجے کا ہے۔

(ڈاکٹر گیان چند۔ امریکہ)

☆☆☆☆☆☆☆

قائداعظم لائبریری لاہور نے گزشتہ برس جناب عنایت اللہ کی صدارت اور ڈاکٹر وحید قریشی کی ادارت میں اردو ادب کے جلیل القدر تاریخی مجلّہ ''مخزن'' کی تجدید اشاعت کی تو اس کا خیر مقدم پوری اردو دنیا میں کھلے بازوؤں سے کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ''مخزن'' نے ۱۹۰۱ء سے ہی صحت مند ادب کی ایک ایسی روایت کی داغ بیل ڈال دی تھی جس میں اس کے بانی شیخ عبدالقادر کی شخصیت کا پرتو موجود تھا اور پھر اس شائستہ روایت کو ہی پوری صدی کے دوران فروغ دینے کی کوشش کی گئی۔ اہم بات یہ بھی ہے کہ ''مخزن'' کے سابقہ ادوار میں شیخ عبدالقادر، راشد الخیری، شیخ محمد اکرام، حفیظ جالندھری نے خدمات ادارت انجام دیں اور آخری دور میں مولانا حامد علی خان اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ حالیہ دور میں اس کی ادارت ڈاکٹر وحید قریشی جیسی بلند پایہ ادبی شخصیت کی تفویض ہوئی تو اسے سابقہ ادوار کے عظیم مدیران کا ہی تسلسل تصور کیا گیا۔ چنانچہ جب ''مخزن'' کا پہلا پرچہ چھپ کر آیا تو اس کے مضامین کے تنوع، فکری مقالات کی ندرت اور تحقیقی و تنقیدی معیار پر بڑی طمانیت کا اظہار کیا گیا۔ اب ''مخزن'' کا دوسرا شمارہ شائع ہو گیا ہے۔ اس کے اداریہ میں ڈاکٹر وحید قریشی نے وضاحت کر دی ہے کہ ''مخزن کا مقصد افراد قوم میں ذوق مطالعہ کی ترویج ہے۔ اس کا کسی سیاسی جماعت یا ادارے سے تعلق نہیں، البتہ پاکستان کے ملی تشخص کی دریافت اور استحکام اس کے دائرہ کار میں شامل ہے''۔

ڈاکٹر صاحب نے ''دائیں اور بائیں'' کی تقسیم سے قطع نظر کرتے ہوئے رسالہ ''مخزن'' میں ہر مکتبہ خیال کے ادبا کو شرکت کی دعوت دی ہے اور لکھا ہے:

> ''ادب کے جدید رجحانات اور مسائل، اس کا خاص موضوع ہیں۔ جدیدیت، مابعد جدیدیت، حقیقت نگاری سرریلزم، علامت نگاری اور تجریدیت، ڈاڈازم سے لے کر ساختیات اور پس ساختیات تک ہر موضوع اور ہر

تحریک اس کے دائرہ عمل کا حصہ ہے۔''

اس اقتباس سے ''مخزن'' کے ادبی دائرے کی وسعت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ''مخزن'' کے زیرِ نظر شمارہ متذکرہ بالا خطوط پر ہی مرتب کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے دنیا کے سماجی تناظر میں دانشور ادیب کی ذمہ داریوں کے تعین کے لیے روسی ادیب سولژے نٹسن کے ایک طویل مضمون سے استفادہ کیا اور عالمی افق پر ابھرنے والے مباحث کو اجاگر کیا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کا مقالہ حلقہ ارباب ذوق کا خطبہ صدارت آج کی داخلی ادبی صورت حال اور ادیب کے کردار پر روشنی ڈالتا ہے۔ محمد ہارون عثمانی نے شعور کی رو پر اردو کے افسانوی ادب کے حوالے سے تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ محترمہ افضل توصیف نے کہانی کے سفر میں اپنی ذاتی آبلہ پائی کی داستان بیان کی ہے۔ اس پرچے کے دوسرے ابواب میں غالبیات، اقبالیات، شخصیات اور سفرنامے، کتابوں پر طویل اور مختصر تبصرے اور تذکرہ مخزن شامل ہیں۔ لکھنے والوں میں پروفیسر فتح محمد ملک، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، محمد حمزہ فاروقی، پروفیسر افضل حق قرشی، خواجہ عبدالحمید یزدانی، پروفیسر عبدالجبار شاکر، ڈاکٹر اسلم فرخی، سلیم آغا قزلباش اور متعدد دوسرے نامور ادبا شامل ہیں۔ چنانچہ یہ کہنا درست ہے کہ ''مخزن'' پڑھنے کے علاوہ اپنے کتب خانے میں محفوظ رکھنے کی چیز بھی ہے۔

﴿نوائے وقت ''سنڈے میگزین'' ۷ جولائی ۲۰۰۲ء﴾

☆☆☆☆☆☆☆

سرورق سے ہی ''مخزن'' ایک معیاری مجلّہ دکھائی دیتا ہے۔ لیکن دور سے ایک بند بوتل ہے۔ جوں ہی اسے کھولیں گے اس میں سے بڑے بڑے جن برآمد ہوں گے۔ مجلس ادارت کو ہی دیکھ لیں۔ عنایت اللہ، انتظار حسین، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر انور سدید، امجد اسلام امجد اور ڈاکٹر وحید قریشی (مدیر اعزازی)۔ یہ وہ نام ہیں جن کی علمیت اور قابلیت ہر قسم کے شک و شبے سے بالاتر ہے۔ سب اپنے اپنے میدانوں کے شاہسوار ہیں۔

مواد کے لحاظ سے بھی اس مجلّے کو کسی بھی ادبی تحقیقی جریدے کے برابر رکھا جاسکتا ہے۔ موضوعات کو نو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ شخصیت و سوانح کے تحت مولانا عبدالمجید سالکؔ پر احمد ندیم قاسمی صاحب کا مضمون اور پروفیسر عبدالحی علوی کی خودنوشت ''اپنی باتیں اپنی یادیں'' خوبصورت تاثر چھوڑتے ہیں۔ خاص طور پر قاسمی صاحب کا مضمون تو خاصے کی چیز ہے۔ مولانا عبدالمجید سالکؔ کی شخصیت کے چند ان چھوئے پہلوؤں کو اس انداز میں سامنے لائے ہیں کہ ان کی عظمت اور بڑھ جاتی ہے۔ عبدالحی علوی صاحب کا خودنوشتی مضمون غالباً طوالت کے باعث آدھا شائع کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ اس کا بقیہ حصہ اگلے شمارے میں آجائے گا۔ علوی صاحب کا انداز بیان انتہائی سادہ اور دلکش ہے۔

ادبی مباحث میں ہمیں ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید کے مضامین نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے ادب اور اخلاقیات کے موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے۔ مدلل انداز تحریر قاری کو منطقی نتیجے پر ضرور پہنچاتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید اردو ادب کی تحریکوں کے حوالے سے پہلے ہی کافی شہرت پا چکے ہیں۔ اس دفعہ انہوں نے بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں پر بات کی ہے۔

اقبالیات کے عنوان کے تحت دو مضامین شامل مجلّہ ہیں۔ مظفر حسین کے مضمون ''روحانی جمہوریت۔ ایک تمدنی تحریک''

کے ذریعے سے اقبالؔ کے نظام افکار میں روحانی جمہوریت کی تشریح کی گئی ہے۔ ''توحید کے اطلاقی پہلو'' ڈاکٹر وحید قریشی کا فکر انگیز مضمون ہے، جو توحید کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیتا اور افکار اقبالؔ کی روشنی میں ان پہلوؤں کی تشریح پیش کرتا ہے۔

''کتابے و گوشہ چمنے'' غالبؔ اور سوداؔ کے شعری افکار کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ پرتو روہیلہ نے کلام غالبؔ میں نئے مفاہیم ڈھونڈے ہیں۔ جو غالب شناسی میں اہم کردار ادا کریں گے۔ مشکور حسینؔ نے غالبؔ کی غزل، جس کا مطلع یوں ہے:

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعت مژگانِ یار تھا

کی تفہیم جمالیات کے چند انوکھے پہلوؤں سے کی ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے مرزا رفیع سوداؔ کی فارسی تصنیف ''عبرۃ الغافلین'' کی روشنی میں سوداؔ کی شاعری کے باب میں خیالات اور ترجیحات قلمبند کیے ہیں۔

کتابوں پر تبصروں کے علاوہ ذوق مطالعہ کی زوال پذیری کے عنوان کے تحت ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر مختار احمد خاں اور امجد اسلام امجد کی آرا مجلّے کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہیں۔ قائداعظم کے حوالے سے ممتاز ادبا کے تاثرات غالباً اس لیے شامل کیے گئے ہیں کہ یہ اس لائبریری کا ادبی مجلّہ ہے جو قائد کے نام پر ہی قائم کی گئی ہے۔ آخر میں لائبریری میں آنے والی نئی کتب کی فہرست قارئین کی معلومات میں اضافہ کرتی ہے۔ لیکن سب سے شاندار بات ''مخزن'' ۱۹۰۱ء کے پہلے شمارے کا اداریہ ''بناوٹ اور سادگی'' ہے۔ اس اداریے سے قبل اصل اداریے کے پہلے صفحے کا عکس بھی دیا گیا ہے اور یوں مخزن ۱۹۰۱ء اور مخزن ۲۰۰۱ء کے تعلق کو مضبوط بنایا گیا ہے۔ اس اداریے کی روشنی میں ۲۰۰۱ء کے ''مخزن'' کو اپنی منزل کی تلاش میں آسانی ہو جائے گی۔

کتب بینی کے رجحان کو تقویت دینے اور ذوق مطالعہ کی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالا دینے میں مخزن یقیناً اہم کردار ادا کرے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ اعلیٰ ادبی ذوق کی تربیت بھی اس کے ثمرات میں شامل ہے۔

(ماہنامہ ''شام و سحر''، اگست ۲۰۰۱ء)

☆☆☆☆☆☆☆

I take this opportunity to congratulate you on the remarkable achievement of having revived the historical journal, Makhzan. Not only does the present version make good reading, it will, in my opinion, go a long way in keeping alive a legacy of scholarship and enlightenment, our cultural heritage, and contribute meaningfully towards the progress of Urdu literature and language.

(MUHAMMAD SAFDAR)
GOVERNOR OF THE PUNJAB

☆☆☆☆☆☆☆

"Khoay huon ki justujoo". "Makhzan" begins with a political article, written by Dr. Jamil Jalbi, in which he summarises the basic idea that marked a Russian revolutionary's booklet. "How to revitalise Russia," in which for the first time somebody commented upon the open policy of Michael Gorbachev. He also mentions a special letter the scholar wrote to the authorities of Russia title "the west on its knees". The crux of these two writings is what Dr. Jamil discussed in his essay and refers to the suggestions given by the Russian scholar in which he says that Russia should not follow the path of the rest of the world but rather revert to a way of living that existed in the past, such as constructing colonies where animals instead of automobiles are used for conveyance. His other suggestions include elevation in the status of women a better educational system, eliminating bribery and rejecting the teachings of Marx and Lemin. A pastoral environment is what the Russian scholar preaches for in which people are socially connected unlike the modern man.

Jamil Jalbi himself concludes the essay by saying that the success of the 20th century is only materialistic and is therefore hollow. The conclusion is that in spite of the industrial success that has stamped the modern world, an individual is essentially unhappy and seeks for a system where he is able to get justice and equality in the true sense of the word.

Another informative essay is by Dr. Moeenud-Din Aqeel in which he expresses the fact that literature is not studied the way it should be in our part of the world. He feels that people in Pakistan limit themselves to the apparent meaning of words alone without searching for the deeper undertones of a piece of literature. He further instructs that the whole world is a global village and hence the literature of any language should be compared and contrasted with the literature of other languages as well.

Apart from these two compositions the periodical includes the essays of the renowned writers like Haroon Usmani and Afzal Tauseef which gives the magazine the exceptional quality in a price range that is affordable to the majority of the readers.

Unlike most Urdu prosaic writings that are coming to the scene this edition has the depth that comes from its originality of substance. It is for this reason that this magazine is not to read simply for leisure but needs concentration that can only come on a quiet study table.

FATIMA MANSOOR

(DAILY "THE NATION" 17TH JULY 2002.)

The present issue of *Makhzan* is well produced with a sober title cover which reflects its standard and contents. The article by Ahmad Nadeem Qasmi about Maulana Abdul Majeed Salik and his own association with him is extremely interesting and is of historical value. A scholarly piece on *Adab aur Akhlaqiat* by Dr. Wazir Agha, and their interaction, is illuminating. That is all I can say about it. In another article, Dr. Anwar Sadeed has made an in-depth appraisal of the literary movements and activities in the 20th century. It is highly informative like all other similar articles by the author. Mercifully, there is no poetry section in the magazine which further goes to prove its sobriety. Some magazines carry all kind of poems just to fill their pages, Makhzan does not need to do that. It has enough to offer to serious readers.

ASHFAQ NAQVI

(DAILY "DAWN" 2ND SEPTEMBER 2001)

☆☆☆☆☆☆☆☆

"Makhzan" is the second edition of the Quaid-e-Azam Library's Literary Magazine. It is one of the few quality publications one gets to read these days.

As one turns each page, the first impression is that of another Urdu edition with a diverse vocabulary, but little sources of interest. However, a deeper analysis reveals that "Makhzan" is not just another literary magazine, it is a magazine with the true essence of Urdu literature and is a treat for anyone who has not read good literature for quite some time.

The interest that envelops a reader as he goes through the journal is essentially because of the diversity of writers and essays that are a part of it, giving the reader an array of topics to choose from.

The language of this piece of literature is steeped into classicism, but its trends are revolutionary, especially in case of the political essays in which the ideas of writers emanate with a yearning for change. Other essays are marked with a sense of concern of modern writers on social as well as personal issues.

The periodical contains topics with a grave and solemn flavour. It is divided into 12 sections, with categories such as literature, travelogues, Ghalib's and Iqbal's poetry, etc. The editor has, however, very skillfully broken the monotony by introducing a humorous section that comes almost at the end of the journal, titled

تبادلے میں موصول ہونے والے رسائل

خلیل احمد جیمہ

درج ذیل رسائل مخزن کے تبادلے میں قائداعظم لائبریری کو موصول ہوئے ہیں۔

نمبر شمار	نام رسالہ	مدیر	مقام اشاعت	موصول شدہ شمارے
۱۔	شاعر	افتخار امام صدیقی	بمبئی: مکتبہ قصر الادب	جلد۷۲ شمارہ ۷، جولائی ۲۰۰۱ جلد۷۳ شمارہ ۱، جنوری ۲۰۰۲ جلد۷۳ شمارہ ۳۔۸، مارچ۔اگست ۲۰۰۲
۲۔	جامعہ	شمیم حنفی	نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ	جلد۹۸ شمارہ ۴۔۶ اپریل۔جون ۲۰۰۱،
۳۔	تسطیر سہ ماہی	نصیر احمد ناصر	لاہور: نصیر احمد ناصر	شمارہ ۱۳۔۱۴ اپریل تا ستمبر ۲۰۰۰ شمارہ ۱۵۔۱۶ اکتوبر ۲۰۰۰ تا مارچ ۲۰۰۱
۴۔	ہفت روزہ ہماری زبان	خلیق انجم	نئی دہلی: انجمن ترقی اردو	جلد۶۰ شمارہ ۵۔۱۲، ۲۱۔۲۵، ۲۷۔۲۸، ۳۹۔۴۱، ۴۴۔۴۸ جلد۶۱ شمارہ ۱۔۲، ۵۔۶، ۹۔۱۶، ۱۸۔۳۲
۵۔	The Annual of Urdu Studies	Muhammad Umer Memon	U.S.A.University of Wisconsin.	No.17, 2002
۶۔	ماہنامہ قومی زبان	ادیب سہیل	کراچی: انجمن ترقی اردو	جلد۴۷ شمارہ ۲۔۳ فروری۔مارچ ۲۰۰۲

۷۔	سہ ماہی نوادر	سید مسعود زیدی حسنین زیدی	لاہور: مجلس یادگار نظیر	شمارہ ۱: مارچ تا جون ۲۰۰۱ شمارہ ۳: اکتوبر ۲۰۰۱ تا مارچ ۲۰۰۲، شمارہ ۴: جولائی تا اکتوبر ۲۰۰۲،
۸۔	مجلہ غالب نامہ	پروفیسر نذیر احمد	نئی دہلی: غالب انسٹیٹیوٹ	جلد۲۳ شمارہ ۲
۹۔	خدا بخش لائبریری جرنل	ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری	پٹنہ: خدا بخش اورینٹیل پبلک لائبریری	شمارہ ۱۲۸ اپریل۔جون ۲۰۰۲
۱۰۔	سہ ماہی اردو ادب	اسلم پرویز	نئی دہلی: انجمن ترقی اردو	جولائی۔اگست ۲۰۰۱ اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۱
۱۱۔	ماہ نامہ سب رس	مغنی تبسم	حیدرآباد (انڈیا): ادارہ ادبیات اردو	جولائی ۲۰۰۲ اگست ۲۰۰۲
۱۲۔	شب خون	عقیلہ شاہین	الہ آباد (انڈیا): عقیلہ شاہین پبلشرز	جولائی ۲۰۰۲ اگست ۲۰۰۲
۱۳۔	انشاء	ف۔س۔اعجاز	کلکتہ: انشاء پبلیکیشنز	جلد۱۶ شمارہ ۵۔۸ مئی۔اگست ۲۰۰۱ جلد۱۷ شمارہ ۱۔۱۰ جنوری۔اکتوبر ۲۰۰۲

قائداعظم لائبریری میں آنے والی نئی اردو کتب

محمد ہارون عثمانی

۱۔ تنقید و ادب / ولی کاکوی ۔۔۔ کراچی: مکتبہ رحمٰن، ۲۰۰۲ء، ص ۵۴۴، قیمت ۴۰۰ روپے

۲۔ سانحہ مشرقی پاکستان: تصویر کا دوسرا رخ / امیر عبداللہ خان نیازی، مترجمہ از شاہ محی الحق فاروقی ۔۔۔ کراچی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۲ء، ۳۵۶ صفحات۔ قیمت ۳۹۵ روپے

۳۔ کوسموس / کارل سیگاں: مترجمہ از یاسر جواد ۔۔۔ لاہور: مشعل، ۲۰۰۱ء۔ ص ۳۹۸، قیمت ۲۲۰ روپے

۴۔ طالبان: اسلام، تیل اور وسط ایشیا میں سازشوں کا نیا کھیل / احمد رشید، مترجمہ از حمید جہلمی ۔۔۔ لاہور: مشعل، ۲۰۰۱ء، ص ۳۳۲۔ قیمت ۲۵۰ روپے

۵۔ پردے سے پارلیمنٹ تک / شائستہ سہروردی اکرام اللہ ۔۔۔ کراچی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۲ء، ص ۱۹۱۔ قیمت ۳۲۵ روپے

۶۔ جرائم اور مجرم: متضاد نظریات کی روشنی میں (سائنسی مطالعہ) / رشید ملک ۔۔۔ لاہور: مشعل، ۲۰۰۰ء، ص ۲۷۴، قیمت ۱۸۰ روپے

۷۔ آگ کی دہلیز: جنوب مشرقی ایشیا کے افسانے / مولفہ ٹریور کیرولان، مترجمہ از مصطفیٰ نذیر ۔۔۔ لاہور: مشعل، ۱۹۹۵ء، ص ۱۴۶۔ قیمت ۱۲۰ روپے

۸۔ بلوغ الارب / مولفہ از محمود شکری آلوسی، مترجمہ از ڈاکٹر پیر محمد حسن ۔۔۔ لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۱ء، ۳ جلدیں

۹۔ تیسری لہر / ایلون ٹوفلر، مترجمہ از تنویر اقبال ۔۔۔ لاہور: مشعل، ۲۰۰۱ء، ص ۵۴۶۔ قیمت ۳۰۰ روپے

۱۰۔ ایک خاتون کی تصویر / ہنری جیمز، مترجمہ از قرۃ العین حیدر ۔۔۔ کراچی: اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۲ء، ص ۴۸۳۔ قیمت ۳۹۵ روپے

۱۱۔ قرآن کے بنیادی موضوعات / فضل الرحمن، مترجمہ از محمد کاظم ۔۔۔ لاہور: مشعل، ۲۰۰۱ء، ص ۲۲۸۔ قیمت ۲۰۰ روپے

۱۲۔ فصیلوں کے ادھر (پاکستان کی فعال خواتین) / ش۔ فرخ ۔۔۔ لاہور: مشعل، ۲۰۰۰ء، ص ۳۱۴۔ قیمت ۲۵۰ روپے

۱۳۔ کلوننگ۔ ایک تعارف / ڈاکٹر عبدالرؤف شکوری ۔۔۔ لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۰ء، ص ۱۴۰۔ قیمت ۱۲۰ روپے

۱۴۔ سچ کہانیاں: بنگالی، گجراتی، مراٹھی، تامل اور ہندی افسانے / مترجمہ از الطاف فاطمہ ۔۔۔ لاہور: مشعل، ۲۰۰۰ء، ص ۲۰۴۔ قیمت ۱۶۰ روپے

۱۵۔ جدید اردو افسانے کے رجحانات / سلیم آغا قزلباش ۔۔۔ کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۰ء، ص ۶۶۶۔ قیمت ۳۲۰ روپے

۱۶۔ پاکستانی ادب شناخت کی نصف صدی / غفور شاہ قاسم ۔۔۔ راولپنڈی: ریز پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۵۶۴۔ قیمت ۳۰۰ روپے

۱۷۔ ادبی مقالات سعید / مرتبہ مسعود احمد برکاتی ۔۔۔ کراچی، ہمدرد فاؤنڈیشن، ۲۰۰۰ء، ص ۱۰۴۔ قیمت ۷۵ روپے

۱۸۔ یورو کے دیس میں / عتیق الرحمٰن ۔۔۔ لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۱ء، ص ۳۳۴

۱۹۔ نقوش قرآن نمبر / مدیر جاوید طفیل ۔۔۔ لاہور: نقوش پبلشرز، ش ۱۴۵، ۲۰۰۱ء، جلد ۳۔۴، قیمت ۲۵۰ روپے فی جلد

۲۰۔ تخلیق مکرر۔ ۲۰۰۱ نوبل انعام یافتگان نمبر / ادارت از صاحبزادہ محمد احمد لاہور: گورنمنٹ کالج، ۲۰۰۱ء، ص ۲۹۵

۲۱۔ پرانی محفلیں یاد آرہی ہیں (آپ بیتی) / عبداللہ ملک ۔۔۔ لاہور: تخلیقات، ۲۰۰۱ء، ص ۴۱۰

۲۲۔ سامراج کے مقابل / مترجمہ از حمید جہلمی ۔۔۔ لاہور: مشعل، ۲۰۰۱ء،

۲۳۔ اقبال احمد کے منتخب مضامین / حسن عابدی ۔۔۔ لاہور: مشعل، ۲۰۰۱ء،

۲۴۔ وہ شام غم کہاں گئی / نعیم صبا ۔۔۔ کراچی: مکتبہ رحمٰن، ۲۰۰۱ء، ص ۲۲۴۔ قیمت ۲۵۰ روپے

۲۵۔ انتخاب کلیات اقبال (فارسی) / ایم رمضان گوہر ۔۔۔ لاہور: مکتبہ گوہر، ۲۰۰۱ء، ص ۲۷۲۔ قیمت ۲۰۰ روپے

۲۶۔ جانوروں کی حیاتیات / فرخندہ منظور ۔۔۔ لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۰ء، ص ۲۹۴۔ قیمت ۲۰۰ روپے

۲۷۔ خلیہ اور اس کے افعال / جمیل اصغر بھٹی ۔۔۔ لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۱ء، ص ۱۳۲۔ قیمت ۷۰ روپے

۲۸۔ دیمک کی کہانی / جاوید احمد ۔۔۔ لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۱ء، ص ۱۵۲

۲۹۔ آئن سٹائن کی کائنات / نائجل کالڈر، مترجمہ از ناصر ایم چوہدری ۔۔۔ لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۰ء، ص ۲۱۵۔ قیمت ۱۲۰ روپے

۳۰۔ فلکیات / مبشر الحق عباسی ۔۔۔ لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۰ء، ص ۴۹۶۔ قیمت ۲۰۰ روپے

۳۱۔ تعارف سمکیات / محمد جمال حیدر ۔۔۔ لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۰ء، ص ۳۳۶۔ قیمت ۳۰۰ روپے

۳۲۔ پاکستان میں کلاب / محمد اشرف شریف ۔۔۔ لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۲ء، ص ۴۳۰۔ قیمت ۲۱۰ روپے

۳۳۔ سرجری ایک تعارف / سلیم الرحمٰن ۔۔۔ لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۰ء، ص ۸۸۔ قیمت ۵۰ روپے

۳۴۔ پہاڑ کی کہانی / محبوب سبحانی ۔۔۔ لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۲ء، ص ۱۱۲۔ قیمت ۶۰ روپے

۳۵۔ سائنس اور انسانیت / مترجمہ از اکرام الحق وڑائچ ۔۔۔ لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۱ء، ص ۱۳۵

۳۶۔ تشریح لغت / مرتبہ محمد اکرم چغتائی، نذیر حق اور محمد اسلم کولسری ۔۔۔ لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۱ء، ص ۹۲۶۔ قیمت ۶۰۰ روپے

۳۷۔ انٹرنیٹ ڈکشنری / محمد بشیر ۔۔۔ لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۱ء، ص ۱۹۵

۳۸۔ جدید سائنس کا آغاز / ٹامس گولڈ سٹائن مترجمہ از رشید ملک ۔۔۔ لاہور: مشعل، ۲۰۰۰ء، ص ۲۰۰۔ قیمت ۱۳۵ روپے

۳۹۔ والٹیر / قاضی جاوید ۔۔۔ لاہور: مشعل، ۲۰۰۱ء، ص ۱۱۲

۴۰۔ پاکستان میں طلبا تحریک / عزیز الدین احمد ۔۔۔ لاہور: مشعل، ۲۰۰۰ء، ص ۲۲۲

۴۱۔ فلمی الف لیلہ حصہ اول / علی سفیان آفاقی ۔۔۔ لاہور: حق پبلشرز، ۲۰۰۱ء، ص ۲۵۸

۴۲۔ پاکستان میں وفاقیت کی سیاست / مہر النساء علی ۔۔۔ کراچی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۰ء، ص ۱۴۴۔ قیمت ۱۲۵ روپے

۴۳۔ عشق تماشا / شہناز مزمل ۔۔۔ لاہور: ندا پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۱۵۲۔ قیمت ۱۲۰ روپے

۴۴۔ قرض وفا / شہناز مزمل ۔۔۔ لاہور: ندا پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۲۰۰۔ قیمت ۱۵۰ روپے